اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

اپریل ۲۰۲۴ء

مُدیر: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

CPL No. 296 Monthly Al Burhan April 2024

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

نمبر شمار	کتاب	صفحات
	عصری تعلیم کی اصلاح (اسلامی تناظر میں)	
۱	ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۴۵۰
۲	اسلامی سکول کے خدوخال	۸۰
۳	تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۱۶۷
۴	یکساں قومی نصاب - خدشات و مضمرات	۲۰۸
۵	تدریس القرآن، پارہ ۱، ۲، ۳، ۳۰ برائے معلمین	۱۶۰
۶	تدریس القرآن، پارہ ۱، ۲، ۳، ۳۰ برائے طلبہ وطالبات	۴۸
۷	پنج سورہ مع پارہ عم (اُردو تفہیم)	۷۶
۸	ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت	۱۲۰
۹	اسلامی علوم میں تحقیق	۲۷۲
	طلبہ کی اسلامی تربیت	
۱۰	تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۱۷۲
۱۱	تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت - ہینڈ بک وگائیڈ	۱۶۰
	اصلاحِ دینی مدارس	
۱۲	ہمارا دینی نظامِ تعلیم	۲۵۰
۱۳	نصابِ مدنیؒ	۴۰
۱۴	مدرسہ ڈسکورسز - مطالعہ و تجزیہ	۱۵۶
۱۵	اصلاحِ دینی مدارس	۳۵۲
	اسلامی تحریکیں	
۱۶	پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟	۲۴۰
۱۷	خاموش انقلاب ناگزیر ہے	۲۸۸
۱۸	عصرِ حاضر میں دین کا متوازن تصور	۸۴
۱۹	نئی اصلاحی تحریک کی ضرورت	۷۲
	تزکیۂ نفس	
۲۰	اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۹۰۳

نمبر شمار	کتاب	صفحات
۲۱	حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۶۲
۲۲	اپنی اصلاح آپ کیسے؟	۵۶
۲۳	ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۲۹۲
۲۴	اسلام اور تعمیر سیرت	۴۰۴
	اسلام اور مغربی فکر وتہذیب	
۲۵	اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۱۷۶
۲۶	اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۱۷۶
۲۷	اسلام اور ردِّ فکرِ مغرب	۲۱۶
	تفہیم دین	
۲۸	مسلم نشاۃ ثانیہ - اساس اور لائحہ عمل	۴۰۰
۲۹	شاتمِ رسول کے قتل کی شرعی حیثیت	۴۸
۳۰	رزم حق و باطل	۸۰
۳۱	اسلام اور پاکستان	۳۰۰
۳۲	عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون	۲۵۰
۳۳	مقالاتِ امین (جلد اوّل)	۶۷۶
۳۴	مقالاتِ امین (جلد دوم)	۶۴۲
	اللغة العربية	
۳۵	السلطة التشريعية _ دراسة مقارنة	۱۵۰
	English Books	
۳۶	Islamization of Laws in Pakistan	250
۳۷	Riyaz us Saliheen I & II	950
۳۸	Literal Translation of the Holy Quran Para 1-10	500

مکتبہ البرہان

136 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

ای میل ermpak@hotmail.com

تدریس القرآن

سبق: ۳

قرآن حکیم کا ترجمہ سیکھنے کے لیے

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ

اٰیاتُھا ۲۸۶ — رُکُوعاتُھا ۴۰

(آیت: ۶-۷) متن قرآن حکیم مع ترجمہ							قرآنی لفظ	اردو استعمال
اِنَّ	الَّذِيْنَ	كَفَرُوْا	سَوَآءٌ	عَلَيْهِمْ	ءَاَنْذَرْتَهُمْ	اَمْ	كَفَرُوْا	کافر، کفار، کفر، تکفیر
بے شک	جنہوں نے	انکار کیا	برابر ہے	ان پر	آیا ڈراؤ تم انہیں	یا	ءَاَنْذَرْتَهُمْ	نذیر و بشیر، انذار، مُنذر
اے نبی! جن لوگوں نے انکار حق (کا فیصلہ) کرلیا ہے، ان کے لیے برابر ہے کہ تم								
لَمْ	تُنْذِرْهُمْ	لَا	يُؤْمِنُوْنَ ﴿6﴾	خَتَمَ	اللّٰهُ	عَلٰى قُلُوْبِهِمْ	خَتَمَ	خاتمہ، ختم نبوت، ختم قرآن
نہ	تم ڈراؤ انہیں	نہیں	وہ ایمان لائیں گے	مہر لگادی	اللہ نے	ان کے دلوں پر		
انہیں خبردار کرو یا نہ کرو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ نے ان کے دلوں پر								
وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ	وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ	غِشَاوَةٌ ز					سَمْعِهِمْ	سماعت، سامعین، سامع
اور ان کے کانوں پر	اور ان کی آنکھوں پر	پردہ ہے					اَبْصَارِهِمْ	بصارت، بصیرت، بصیر
اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے							غِشَاوَةٌ	غش آنا، غشی طاری ہونا
وَّلَهُمْ	عَذَابٌ	عَظِيْمٌ ﴿7﴾ ع					عَظِيْمٌ	اعظم، عظیمت، معظم
اور ان کے لیے	عذاب ہے	بڑا۔						
لہٰذا ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔								

اہم نکات

مشکل الفاظ کے معانی

۱۔ جوڑ کر لکھے گئے الفاظ: اَنْذَرْتَهُمْ: اَنْذَرْ تَ + هُمْ

۲۔ غِشَاوَةٌ کا لفظی ترجمہ ہے پردہ۔ جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں آدمی پر "غشی" طاری ہوگئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے حواس پر پردہ پڑ گیا ہے اور وہ بے ہوش گیا ہے۔

۳۔ كَفَرُوْا: کفر کا لفظی معنی ہے انکار کرنا۔ کافر وہ لوگ ہیں جو اپنی سماعت، بصارت اور عقل و دل کی صلاحیتوں کا غلط استعمال کرتے ہیں اور اللہ کے بتائے ہوئے حق کا انکار کرتے ہیں۔

بقیہ آخری صفحہ پر ☜

مفہوم کا خلاصہ

۱۔ پچھلے سبق میں اللہ تعالیٰ نے مومنین کی صفات بیان فرمائیں اس سبق میں کفار یعنی منکرین حق کا ذکر ہے۔

۲۔ کفار سوچ سمجھ کر، عمداً اور اپنے حقیر دنیوی مفادات کے لیے حق کا انکار کرتے ہیں لہٰذا وہ قبولِ حق کی استعداد کھو بیٹھتے ہیں اور خود ہی اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ تاہم قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ اس بات کو اس انداز میں بیان فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

۳۔ کفار کو آخرت میں سخت عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کفر در حقیقت نتیجہ ہوتا ہے اپنی سماعت، بصارت اور دل و دماغ کی صلاحیتوں کے غلط استعمال کا۔

۴۔ ختم اصل میں اس مہر کو کہتے ہیں جو کسی خط کو لفافے میں بند کر کے اس پر (لاکھ کی صورت میں) لگائی جاتی ہے (اور اب بھی کئی دفتروں میں لگائی جاتی ہے) تاکہ وہ خط راز میں رہے اور اگر کوئی اسے کھولے تو پتہ چل جائے۔ خط پر مہر لگانے کا مطلب یہ ہے کہ خط کا مضمون مکمل اور ختم ہو گیا اور اب اس میں کسی اور بات کا اضافہ نہیں ہو سکتا۔ دل پر مہر لگنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ دل گویا اب بند ہو گیا ہے اور اس میں قبولیت حق کی استعداد باقی نہیں رہی۔ اسی سے اس لفظ میں کسی چیز کے خاتمے اور آخری ہونے کا مفہوم پیدا ہوا جو ختم نبوت کے تصور کی وجہ سے معروف اور مروّج ہے۔ 'ختم قرآن' کا بھی مطلب ہے پورا قرآن پڑھنا، اسے پڑھ کر ختم کرنا۔

حاصل کردہ سبق

۱۔ اپنے صاحبِ ایمان ہونے پر اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں مسلمان گھرانے میں پیدا کیا

۲۔ اور کفر اور اللہ کی نافرمانی سے بچنے کی دعا بھی کرتے رہو اور اس کے لیے کوشش بھی کرتے رہو۔

'تدریس القرآن'

جلد اوّل [الفاتحہ-النساء]

مرتب: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

زیرِ طبع ہے

اس کی اشاعت میں حصہ لے کر ثوابِ دارین حاصل کریں

تحریکِ رجوعِ اِلی القرآن

برائے تفصیلات: 0300-4107282

جلد ۲۸
ماہنامہ
البرہان
لاہور
Since 2010
شمارہ ۴

برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhaan.pk

اپریل ۲۰۲۴ء/ رمضان المبارک ۱۴۴۵ھ

آئینہ مضامین

فکرونظر

جان لیوا مخمصہ ۔ غزہ	مدیر	۴

مقالۂ خصوصی

عصرِ حاضر میں اسلام کا سیاسی نظام پاکستان کے لیے ایک عملی خاکہ	ڈاکٹر محمد امین	۹

تعلیم وتربیت

۔تسہیل القرآن		۷
۔یونیورسٹیوں میں زوالِ تحقیق	پروفیسر عبداللہ	۳۷
۔نئی نسل کے رجحانات اور ہمارا نصابِ تعلیم	طارق سلیم لون	۳۸
۔استعمار اور مسلم اصطلاحات	ادارہ	۴۲

تزکیۂ نفس

۔دین کیا ہے اور دینداری کسے کہتے ہیں؟	احمد جاوید	۴۳
۔کینہ : ایک مہلک اخلاقی مرض	مدیر	۴۶
۔ہم نے رمضان سے کیا حاصل کیا؟	حافظ محمد عمران طحاوی	۴۸
۔ہمارا عقیدہ عمل میں کیوں نہیں ڈھلتا؟	سلمان آصف صدیقی	۵۰

تفہیم دین

استفتاء: قادیانیوں کے بارے میں غامدی صاحب اور ان کے حمایتیوں کے مؤقف کی شرعی حیثیت	ڈاکٹر محمد امین	۵۹

ملی مجلس شرعی

قادیانیوں سے متعلق چیف جسٹس آف پاکستان کے فیصلے پر تبصرہ اور تجاویز	ملی مجلس شرعی	۶۵

اسلام اور مغرب

۔کیا سائنسی ترقی ناگزیر ہے؟	سرفراز احمد	۷۴
۔یورپی یونین کی حجاب پر مجوزہ پابندی	اسعد مرزا	۷۹

مدیر
ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر
ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
حافظ محمد عمران طحاوی

لیگل ایڈوائزر
محمد یحییٰ رشید، ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن
(0300-4107282)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 85 روپے
سالانہ 1000 روپے۔ پانچ سال: 5000 روپے
تاحیات 20,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ
136 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف
0306-4640366

فکرونظر

جان لیوا مخمصہ
امریکہ،فوج،اسلام اور پاکستان
[ایک نوجوان سے مکالمہ]

چند دن پہلے ایک نوجوان ہمارے دفتر میں آیا اور میرا پوچھا۔ کہنے لگا آپ پروفیسر ڈاکٹر محمد امین صاحب ہیں؟ مَیں نے کہا: جی،فرمایئے۔ کہنے لگا کہ آپ کس یونیورسٹی میں استاد ہیں؟ مَیں نے کہا: کئی یونیورسٹیوں میں پڑھایا ہے۔ کہنے لگا، مہربانی ہوگی اگر آپ میرے ایک سوال کا جواب دے دیں کیونکہ مجھے اس سوال کا جواب نہیں مل رہا اور مَیں سخت مخمصے میں ہوں اور بہت مضطرب ہوں۔ مَیں نے کہا: جی پوچھیے: کہنے لگا کہ پاکستانی معاشرے اور ریاست کی جو اس وقت کیفیت ہے آپ کو اس کا احساس ہے؟ مَیں نے کہا: آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ وہ کہنے لگا کہ پاکستان اِس وقت جس معاشی سیاسی،سماجی،اخلاقی،دینی بحران میں مبتلا ہے۔ یہ کوئی اتفاق اور سانحہ نہیں ہے بلکہ سب کچھ ایک پلاننگ کے تحت ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ اس کے پیچھے امریکہ ہے جسے مسلمانوں کا عموماً اور پاکستان کا خصوصاً کوئی بھلا درکار نہیں ہے اور اس کی سب سے بڑی نمائندہ اور کارندہ ہماری فوج ہے۔ مَیں نے کہا: ملک میں دوسرے طبقات بھی تو ہیں۔ سیاستدان ہیں،علماء اور دینی جماعتیں ہیں۔ کہنے لگا سب کی حیثیت ثانوی ہے۔ ام الامراض اور ساری خرابیوں کی جڑ یہ دو ہی ہیں۔ امریکی دستاویزات جو اوپن ہوئی ہیں ان سے واضح ہے کہ ایوب خان قیام پاکستان کے وقت سے ہی امریکہ سے رابطے میں تھا اور پاکستان کو امریکی حمایت سے اپنی اور اس کی مرضی کے مطابق چلانا چاہتا تھا جس میں اسلام بہر حال کوئی محرک نہیں تھا۔ مَیں نے کہا جناح اور لیاقت علی خان بھی تو امریکہ کے حمایتی تھے۔ کہنے لگا بلاشبہ تھے لیکن وہ قوم سے کیے گئے 'اسلام' اور 'نظریۂ پاکستان' کے وعدوں سے مُکر نہ سکتے تھے۔ اس لیے جلد ان سے جان چھڑا لی گئی۔ بعد میں جو کچھ ہوا یا تو فوج نے خود اپنی حکمرانی میں کیا یا اس نے بلڈی سویلینز سے کرایا۔ فوج یا تو بادشاہ تھی یا بادشاہ گر۔

مَیں نے کہا: چلیے بفرضِ محال آپ کی بات مان بھی لی جائے تو اب مسئلہ کیا ہے؟ فوج بھی تو ہماری ہی ہے، کوئی کافر تو نہیں ہے؟ اس نے کہا: کافر تو نہیں لیکن کافر امریکہ کی کارندہ ضرور ہے اور امریکہ کو بہر حال نہ اسلام چاہیے اور نہ مضبوط پاکستان۔ مَیں نے کہا: بیٹے! آپ کا مسئلہ کیا ہے؟ اس نے کہا مسئلہ ہے عمران خان؟ مَیں نے کہا: عمران خان؟ اس کا اس مسئلے سے کیا تعلق ہے؟ وہ کہنے لگا: مَیں ان لاکھوں کروڑوں نوجوانوں میں سے ہوں جن کو خان نے نئے پاکستان کے خواب دکھائے۔ مَیں نے کہا اور آپ کے وہ خواب پورے نہیں ہوئے؟ وہ کہنے لگا: نہیں! امریکہ اور فوج نے وہ پورے نہیں ہونے دیے۔ مَیں نے کہا: چلیے بحث کی خاطر آپ کی بات مان لی! اب آپ کہاں اٹکے ہوئے ہیں؟ اس نے کہا: اس دفعہ فرق یہ ہوا ہے کہ پہلے جب بھی کرائسز آیا تو سیاستدانوں نے فوج سے ملی بھگت کر لی۔ انہیں اپنا ذاتی مفاد چونکہ عزیز تھا اس لیے وہ امریکہ اور فوج کی ماتحتی میں کام کرنے پر تیار ہو گئے یا خاموش ہو گئے یا ملک سے باہر چلے گئے۔ اس دفعہ جب امریکہ اور فوج نے عمران کی حکومت گرائی تو عمران نے ہمیں باور کرایا کہ وہ مظلوم ہے اور ہم اس کا ساتھ دینے پر تل گئے۔ فوج نے ۸ مئی کرایا اور مزید جو ظلم وستم کیا اس تفصیل کا سب کو پتا ہے۔ ہر بات کے جواب میں الیکشن مانگتا رہا۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ عوام الیکشن میں اس کا ساتھ دیں گے اس نے دیا۔ لیکن فوج یہاں بھی آڑے آ گئی اور اس نے جھرلو سے اقتدار خان کو نہیں لینے دیا اور بے ضمیر سیاستدانوں کو ساتھ ملا لیا۔ مَیں نے کہا یہ تو سب کے سامنے ہو رہا ہے۔ آپ کا مسئلہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میرے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ مَیں کیا کروں؟ خان نے تبدیلی کا جو خنّاس میرے ذہن میں بھر دیا تھا وہ اب نکلتا نہیں! اگر ساری قوم کے ووٹ سے بھی تبدیلی نہیں آنی اور فوج نے نہیں آنے دینی تو تبدیلی کیسے آئے گی؟

مَیں نے کہا آپ کیا سوچتے ہو؟ اس نے کہا ایک فوجی جرنیل نے جب مشرقی پاکستان میں وہ ظلم وستم کیا جو آج فوج پاکستان میں کر رہی ہے تو وہاں کا نوجوان بھارت سے مل گیا کیونکہ اس کے پیشِ نظر اسلام نہیں تھا محض فوج کا ظلم وستم تھا اور اس نے بھارت سے مل کر آزادی حاصل کر لی۔ میرا مخمصہ یہ ہے کہ مجھے پاکستان بھی چاہیے اور اسلام بھی؛ اور فوج کی غلامی سے نجات بھی۔ جب تبدیلی کے سارے پر امن راستے فوج نے بند کر دیے ہیں تو اب

ہتھیار اٹھائے بغیر چارہ نہیں لیکن ہتھیار اٹھاتا ہوں تو بھی پاکستان کا نقصان ہوتا ہے اور اگر کسی بیرونی طاقت کا سہارا لیتا ہوں تو بھی اسلام اور پاکستان کا نقصان ہوتا ہے۔ مَیں اس مخمصے میں ہوں کہ کروں تو کیا کروں؟

مَیں نے کہا: فوج کے خلاف ہتھیار اٹھانا کوئی حل نہیں۔ میرے نزدیک اس کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ تم لوگ عوام کو بیدار کرو۔ انہیں متحرک کرو جب وہ اٹھ کھڑے ہوں گے تو کوئی ان کا راستہ نہیں روک سکے گا، فوج بھی نہیں۔ وہ کہنے لگا لوگ بیچارے دووقت کی روٹی کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس بجلی اور گیس کے بل دینے کو پیسے نہیں، وہ اپنے مسائل میں پھنسے ہوئے ہوں، وہ کیسے ان ظالموں کا راستہ روک سکتے ہیں؟ مَیں نے کہا میری عقل سمجھ میں اس کے علاوہ کوئی حل نہیں۔ اس سے پہلے دو دفعہ عوام اٹھی ایک دفعہ ایوب خان کے خلاف اور دوسری دفعہ بھٹو کے خلاف۔ اب بھی عوام کو اٹھانا ہی حل ہے، اسے ہی آخری امید بناؤ۔ وہ کہنے لگا آپ جن دو مواقع کا ذکر کر رہے ہیں اس سے بھی فوج ہی فائدہ اٹھایا۔ ایوب گیا تو یحییٰ خان آ گیا اور بھٹو گیا تو جنرل ضیاء الحق آ گیا۔ عوام کے ہاتھ تو کچھ نہیں آیا؟ مَیں نے کہا یہ اس وقت کی سیاسی قوتوں کی ناکامی ہے کہ وہ اس موقع کو اپنے فائدے میں نہ بدل سکیں۔ اب ایسا موقع آئے تو تم ہوشیار رہنا کہ کوئی دوسرا اس سے فائدہ نہ اٹھالے جائے۔ اردوان کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ عوام اٹھ کھڑے ہوں تو فوج بھی پسپا ہو جاتی ہے۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا: مجھے آپ کی بات پر فوری طور پر شرحِ صدر تو حاصل نہیں ہوا لیکن آپ کی بات قابل غور ضرور ہے۔ مَیں اس پر سوچوں گا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔

غزہ غزہ غزہ

* اے پیٹ بھر کر افطاریاں کرنے والو اور کروانے والو! غزہ کے بچے بھوک اور پیاس سے مر رہے ہیں۔

* مسلمانوں کے حکمران حمیت کھو چکے اور ہماری دین کی علمبردار جماعتیں غزہ کے بھوکے شہید ہوتے بچوں کے لیے بھی متحد ہونے کو تیار نہیں! * الامان، الحفیظ

* مسلمانو! اللہ کے غضب سے ڈرو۔ اب بھی نہیں تو کب ڈرو گے؟

مرتب: ڈاکٹر محمد امین

تسہیل القرآن
فہمِ قرآن کے لیے

* قرآن کریم کی عربی عبارت کا مفہوم اُردو زبان میں
* جمہور مفسرین کی راہ سے نکلے بغیر
* زائد الفاظ نسخ میں دیے گئے ہیں

سورۃ البقرہ

آیت (۸-۱۸)　　　منافقین کا ذکر

عربی متن	مفہوم
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿8﴾	اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ: * ہم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لے آئے ہیں لیکن وہ درحقیقت مومن نہیں ہیں۔
يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿9﴾	* یہ اللہ کو اور مومنوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں مگر یہ دراصل اپنے آپ ہی کو دھوکہ دیتے ہیں لیکن انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿10﴾	* ان کے دلوں میں نفاق کا مرض تھا جس کا فیصلہ انھوں نے خود کیا تھا لہٰذا اللہ نے بھی ان کا یہ مرض بڑھا دیا ہے اور وہ دردناک عذاب کے مستحق ہوں گے اس سبب کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔
وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿11﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿12﴾	* جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اپنے اس طرز عمل سے زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ اے مومنو! آگاہ رہو یہی لوگ فساد کرتے ہیں لیکن انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰـكِنۡ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿13﴾

* اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اس طرح ایمان لاؤ جس طرح دوسرے سچے مومن ایمان لائے ہیں، تو کہتے ہیں کہ کیا ہم احمقوں کی طرح ایمان لائیں۔ مسلمانو! آگاہ رہو۔ درحقیقت یہی احمق ہیں لیکن وہ اس کی حقیقت نہیں سمجھتے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوۡا اِلٰى شَيٰطِيۡنِهِمۡ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا مَعَكُمۡ ۙ اِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿14﴾ اَللّٰهُ يَسۡتَهۡزِئُ بِهِمۡ وَيَمُدُّهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ﴿15﴾

جب وہ مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لا چکے ہیں اور جب اپنے شیطان ساتھیوں کے ساتھ تنہا ہوتے ہیں تو انہیں بتاتے ہیں کہ ہم دراصل تمہارے ساتھ ہیں، مسلمانوں سے تو ہم محض مذاق کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ھے کہ اللہ ان کا مذاق اڑا رہا ہے اور وہ یوں کہ انہیں ڈھیل دے رہا ہے اور وہ بھٹکتے پھر رہے ہیں لیکن وہ اسے اپنی کامیابی سمجھتے ھیں۔

اُولٰٓـئِكَ الَّذِيۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالۡهُدٰى ۖ فَمَا رَبِحَتۡ تِّجَارَتُهُمۡ وَمَا كَانُوۡا مُهۡتَدِيۡنَ ﴿16﴾

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی ہے اور انہیں اس تجارت میں کوئی فائدہ نہیں ہوا، الٹا ہدایت سے محروم ہوئے ہیں۔

منافقین کی مثال

مَثَلُهُمۡ كَمَثَلِ الَّذِى اسۡتَوۡقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّاۤ اَضَآءَتۡ مَا حَوۡلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوۡرِهِمۡ وَتَرَكَهُمۡ فِىۡ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ ﴿17﴾ صُمٌّ ۢ بُكۡمٌ عُمۡىٌ فَهُمۡ لَا يَرۡجِعُوۡنَ ﴿18﴾

ان منافقین کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی جس سے اس کا ماحول خوب روشن ہو گیا۔ پھر اللہ نے ان کی روشنی صلب کر لی تو ہر سو اندھیرا چھا گیا اور اب انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ گویا بہرے ہیں (کہ حق نہیں سنتے)، گونگے ہیں (کہ حق کا اظہار نہیں کر سکتے) اور اندھے ہیں (کہ حق ان کو دکھائی نہیں دیتا) تو یہ حق کی طرف کیسے پلٹیں گے؟

مقالۂ خصوصی مدیر

عصرِ حاضر میں اسلام کا سیاسی نظام

پاکستان کے لیے ایک عملی خاکہ

[اہلِ علم سے درخواست ہے کہ وہ میری ان معروضات پر غور فرمائیں، ان پر جِک واضافہ کریں یا متبادل تجاویز دیں۔ شکریہ، مدیر]

ضرورت

مسلمانوں نے بارہ صدیوں تک دنیا کے ایک بڑے حصے پر میرٹ پر حکومت کی۔ اُس وقت وہ زندگی کے ہر شعبے میں دنیا سے آگے تھے۔ پھر ان کو زوال نے آلیا جس کے متعدد اسباب تھے۔ ایک مرکزی سبب یہ تھا کہ ان کا نظامِ تعلیم وتربیت اور دعوت واصلاح وتزکیہ کمزور اور خراب ہوگیا۔ ان کا ایمان کمزور ہوگیا جس سے وہ اعمالِ صالحہ پر قادر نہ رہے اور ان میں وہ صلاحیتیں اور بنیادی انسانی اخلاق ناپید ہوگئے جو دنیا میں قطعِ اسباب اور دوسروں کے مقابلے میں دنیا کو بہتر انداز سے چلانے کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ منجملہ دوسرے اسباب کے ان کے زوال کی ایک وجہ ان کا سیاسی عدمِ استحکام بھی تھا۔

۱۹۲۴ء میں اس برے بھلے 'خلافت' کے نظام کا بھی خاتمہ ہوگیا جو سلطنتِ عثمانیہ کی صورت میں موجود تھا۔ یورپی استعمار جو اسلام اور مسلم دشمن تھا، اس نے مسلم ممالک پر قبضہ کر کے انہیں غلام بنالیا اور مسلم معاشرے میں تیار کردہ اس سیاسی، معاشی، عدالتی، تعلیمی ڈھانچے کو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت توڑ دیا جو مسلمانوں نے قرآن وسنت کی روشنی میں پچھلے بارہ سو سال سے قائم کر رکھا تھا اور اس کی جگہ مغربی فکر وتہذیب کی بنیاد پر سارے شعبہ ہائے حیات کا نیا ڈھانچہ کھڑا کر دیا اور یوں مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے غلام بنائے رکھنے کی منصوبہ بندی کی۔

اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی۔ اس کی توفیق سے مسلمانوں نے استعمار کی مزاحمت شروع

کی اور دوسری جنگ عظیم میں یورپی ممالک باہمی لڑائی سے کمزور ہوئے تو وہ مسلم ممالک کو آزادی دینے پر مجبور ہوئے۔ اس وقت مسلمان ایک دوراہے پر کھڑے تھے۔ ان کے لیے ایک موقع تو یہ تھا کہ وہ اپنے 'خلافت' کے سیاسی نظام میں ضروری ردّ و بدل کر کے اسے جاری رکھتے لیکن چونکہ دو اڑھائی صدیوں کی غلامی کے دوران اہلِ مغرب اپنے سیاسی نظام کا، جو نیشنل ازم اور ڈیموکریسی وغیرہ پر مبنی تھا، مسلمانوں کو اس کا عادی بنا چکے تھے اور مسلمانوں کو اس کے بہتر و برتر ہونے کا یقین دلا چکے تھے اور اس نے مسلم ممالک میں جان بوجھ کر اور عمداً اقتدار علماء و دینی عناصر کی بجائے ان لوگوں کے سپرد کیا جو اس کی تہذیب کے رسیا تھے، اس پر عمل کرنا چاہتے تھے اور اسے ہی دنیا میں استحکام و ترقی کا موجب گردانتے تھے۔ چنانچہ اکثر مسلم ممالک کے حکمرانوں نے مغرب کے نیشنلزم اور جمہوریت کو قبول کر لیا اور اس سے صَرفِ نظر کر لیا کہ وہ سراسر ایک غیر اسلامی سیاسی نظام تھا جو مسلمانوں کے لیے مفید نہ تھا بلکہ مضر تھا۔

تقسیم پاک و ہند کے بعد پاکستان میں دینی عناصر نے کوشش کی اور مغرب کے نیشنلزم اور جمہوریت پر مبنی کافرانہ نظام میں کچھ اسلامی اصول داخل کر کے اور انہیں حکمرانوں سے منوا کر اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دے دیا حالانکہ کفر و اسلام کا یہ ملغوبہ نظری طور پر ممکن ہی نہ تھا لیکن چونکہ حکمران اپنے مغربی آقاؤں کے عطا کردہ سیاسی نظام سے ہٹنے پر آمادہ نہ تھے لہٰذا دینی عناصر نے 'اسلامی جمہوریت' ہی کو غنیمت سمجھا اور اس کے ذریعے نفاذِ اسلام اور غلبۂ دین کا خواب دیکھنے لگے۔ اس ملغوبہ سیاسی نظام کو قائم ہوئے پون صدی گزر چکی لیکن اس کے نتیجے میں مغربی فکر و تہذیب کے اصول و اقدار ہی نے پاکستانی معاشرے و ریاست میں غلبہ پایا ہے اور عامۃ الناس روز بروز دین سے دور ہو رہے ہیں اور مغربی تہذیب کے اصولوں پر عمل کر رہے ہیں۔

پاکستان کے دینی سیاسی عناصر یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں لیکن جس غلط راہ پر وہ چل پڑے تھے، ان کے لیے اس سے باز آنا مشکل ہو رہا ہے کہ بقول شاعر ؎

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

ان کو یہ احساس بھی نہیں رہا کہ ان کے کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیلِ نو کرتے اور اس پر عمل کرتے۔ پاکستان میں اس جمہوری سیاسی عمل کو ۷۷ برس گزر چکے لیکن دینی سیاسی جماعتوں کو کامیابی نہیں ملی اور بین الاقوامی مسلم دشمن حکومتیں اور ان کے مقامی ایجنٹ ان کو کامیاب ہونے بھی نہیں دیتے۔

دریں اثنا مجلس فکر ونظر نے سوچا کہ پہلے علمی کام کیا جائے۔ مطلوبہ اسلامی سیاسی نظام کا ایک ایسا خاکہ تیار کیا جائے جو پاکستانی تناظر میں قابلِ عمل ہو، مسلم سکالرز، علماء کرام اور اسلامی ذہن کے قانونی ماہرین کو اس پر اکٹھا کیا جائے اور ان سب کی مشاورت سے اس خاکے میں کمی بیشی کر کے عصر حاضر میں اسلام کے سیاسی نظام کا ایک متفقہ بلیو پرنٹ تیار کیا جائے اور پھر ساری دینی قوتوں کو اس پر عمل کے لیے اُبھارا جائے تاکہ وہ غیر اسلامی سیاسی نظام کی بجائے اس اسلامی سیاسی نظام کو بروئے کار لانے کی جدوجہد کریں۔

نوعیت

آگے بڑھنے سے پہلے یہ ذہن میں رکھیے کہ اسلام کا سیاسی نظام کوئی گھڑا گھڑایا (Ready made) نظام نہیں ہے جو قرآن حکیم یا سنت رسول سے اٹھا کر ہم کہیں چسپاں کردیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی بے پایاں رحمت اور حکمت سے یہ طے کر رکھا ہے کہ وہ ان معاملات کو قرآن حکیم میں وضاحت اور تفصیل سے بیان کر دیتا ہے جنہیں بدلنے کی ضرورت نہ ہو اور جن میں عقلِ انسانی کے پھسلنے کا امکان غالب ہو اور ان کی نوعیت ایسے بنیادی امور کی ہو کہ اگر وہ صحیح نہ ہوں تو انسانی معاشرہ صحیح خطوط پر کام ہی نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بنیادی عقائد، عبادات اور اخلاق کے ضروری عناصر اور معاملات کے بعض پہلو (وراثت اور نکاح وطلاق کے مسائل وغیرہ) تفصیل سے بیان کر دیے لیکن وہ امور جن کو زمان ومکان (Time and space) کے ساتھ بدلنے کی ضرورت تھی، ان میں صرف بنیادی پالیسی کے اصول دینے پر اکتفا کیا اور تفصیلات کا تعین امت کے اہل علم و مجتہدین پر چھوڑ دیا۔ گویا اسلامی نظام کی اساسیات اور اہم اصول اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے بتا دیے ہیں اور ان اصولوں میں تفصیلات اور فروعات کا اضافہ کر کے کسی بھی زمانے اور علاقے کے مسلمان اپنا اسلام کا

سیاسی نظام ڈویلپ کر سکتے ہیں۔ یوں یہ عمل ایک اجتہادی کاوش ہوتا ہے جو زمان ومکان کی تبدیلی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ لہٰذا مجلس فکر ونظر نے پاکستان میں اسلام کے سیاسی نظام کا جو خاکہ تیار کیا ہے، وہ اس پروسیس میں ایک ابتدائی کاوش ہے اور اس کو پاکستان کے علماء کرام واہلِ علم ودانش کے باہم مشورے سے اس میں کمی بیشی کر کے اسے ایک متفق علیہ ڈاکومنٹ بنایا جاسکتا ہے جسے عصر حاضر میں خصوصاً پاکستانی تناظر میں اسلام کا سیاسی نظام کہا جاسکے۔

بنیادی اپروچ

مندرجہ بالا گزارشات سے ظاہر ہے کہ عصر حاضر میں اسلام کے سیاسی نظام کا خاکہ تیار کرنے کا منہج مندرجہ ذیل ہوسکتا ہے:

۱۔ قرآن وسنت کے وہ ناقابلِ تغیر احکام جو سیاست سے متعلق ہیں اور اس معاملے میں بنیادی اصول اور قابل قدر رہنمائی مہیا کرتے ہیں۔

۲۔ اسلام کے سیاسی نظام کے حوالے سے امت کے تجربات یعنی خلافت راشدہ میں صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل اور زمانۂ مابعد میں مسلمانوں اور ان کے حکمرانوں کا سیاسی طرزِ عمل اور شرعی اصولوں پر انطباق کی مختلف صورتیں۔

۳۔عصرِ حاضر کی ضرورتوں اور تقاضوں کو پیش نظر رکھنا۔

۴۔ مغربی فکر وتہذیب کو ردّ کرنا اور اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیلِ نو میں اس سے مدد نہ لینا کیونکہ مغربی فکر وتہذیب، جو استعمار کی فکر وتہذیب ہے غیر اسلامی اصولوں پر مبنی ہے اور ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم اور ایمپیریسزم جیسے کفریہ افکار کی پیداوار ہے۔اس کے علمبردار مغربی ممالک (اور ان کے حلیف) اسلام اور مسلمانوں کے صریح دشمن ہیں۔قرآن وسنت ان کی اسلام دشمنی کو واضح طور پر بیان کرتے ہیں اور امت کا یہ آنکھوں دیکھا مشاہدہ اور تجربہ ہے جس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں گویا ؏ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

جس طرح ماضی میں مغربی سامراج نے مسلم ممالک کو روندا، کچلا، لوٹا، غلام بنایا اور انہیں مستقل غلام رکھنے کے لیے کوششیں کیں اور آج بھی وہ مسلمانوں کو پسماندہ اور مفلس

رکھنے، دین اور اتحاد سے دور رکھنے (جو ان کی قوت کا منبع ہے) کے لیے کوشاں ہے۔ اس نے پچھلی چند دہائیوں میں جس طرح ہمارے دیکھتے عراق، افغانستان اور لیبیا کو تباہ کیا ہے، شام اور یمن تباہ کیے جارہے ہیں اور پاکستان، ترکی، سعودی عرب، ایران وغیرہ پر مغرب کا شدید دباؤ موجود ہے۔ ان حقائق کے ہوتے ہوئے اگر ہم مغربی فکر وتہذیب اور اس کے سیاسی نظام کو اپنانے اور اس کی نقل کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ بے عقلی، سفاہت اور بے حمیتی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ لہٰذا ہم نے بطور منہج یہ طے کیا ہے کہ ہم اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیلِ نو کرتے ہوئے نہ مغرب کی الحادی فکر وتہذیب سے استفادہ کریں گے اور نہ اس کی اصطلاحات وتصورات استعمال کریں گے جیسے جمہوریت، اسلامی جمہوریت، ریاست، پارلیمنٹ کی بالادستی، آئین کی تقدیس، نمائندگی کا تصور، عوام کی حاکمیت، حزبِ اختلاف، حزبِ اقتدار، مغربی طرز کے انتخابات، مقننہ اور قانون سازی، انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ کے درمیان توازن وغیرہ۔

اسلام کے سیاسی نظام کے بنیادی اصول وتصورات

ا۔ شریعت کی بالادستی

اسلام کا بنیادی تصور یہ ہے کہ نہ صرف انسان بلکہ پوری کائنات کا خالق ومالک ، معبود وہادی اور ربّ ومدبر ایک اللہ تعالیٰ ہے۔ زمین وآسمان میں بادشاہی اس کی ہے۔ اسلام کا لفظی مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ کی الوہیت وخدائی وکبریائی وعظمت کو قبول کیا جائے اور جو انسان اس بالادستی کی کلی اور بلاشروط وحدود واطاعت کا اعلان کرے 'وہ مسلم' کہلاتا ہے۔ لہٰذا مسلمان اپنے عہد کی رو سے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں شریعت کی بالادستی کو تسلیم کرتا ہے۔ گویا جن معنوں میں مغرب کے سیاسی نظام میں ساورنٹی (Sovereignty) اور حاکمیت کا تصور ہے اور وہاں عوام اور ان کے نمائندے ساورن اور حاکم ہوتے ہیں، اسی طرح اسلام میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور ان کی طرف سے عطا کردہ ہدایت، جسے ہم دینِ اسلام یا شریعتِ اسلام کہتے ہیں وہی مسلمانوں کی انفرادی زندگی میں اور اجتماعی زندگی یعنی معاشرے اور ریاست میں فیصلہ کن اتھارٹی کا کردار ادا کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں مسلم ریاست میں اللہ کا دین اور اس کی شریعت ہی کی بالادستی ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ﴿اِنِ

الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ [یوسف ۲: ۴۰] اور﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ﴾ [آل عمران ۳: ۵۴] اور﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾[المائدۃ ۵: ۴۴]۔اس کا منبع ومظہر قرآن وسنت ہیں یعنی لوگوں کی ہدایت کے لیے اللہ کی طرف سے بھیجی گئی کتاب (قرآن مجید) اوراس کی وضاحت اور تنفیذ کے لیے بھیجے گئے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت (ان کا قول،فعل اور تقریر) جسے وحی کی صیانت حاصل تھی لہٰذا اس کے غلط ہونے کا کوئی امکان موجود نہیں اسی لیے مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کے دین کے ماخذ قرآن وسنت ہیں۔

اس سے واضح ہوگیا کہ اسلام کے سیاسی نظام کے حوالے سے بنیادی اصول وہ ہیں جو قرآن وسنت میں بیان ہوئے ہیں اور انہی کی روشنی میں اور ان کے ذکر کردہ مقاصد کے مطابق ہی مزید اجتہادی تفصیلات وضع کی جاسکتی ہیں اوراس خاکے میں وضع کی جائیں گی۔

یہاں یہ یادرکھنا چاہیے کہ مسلمانوں کے بارہ سوسالہ اقتدار میں خلافت کے ساتھ یا اس کے تحت سلاطین، امراء، ملوک بھی برسر اقتدار رہے ہیں لیکن ایک آدھ استثنٰی کے علاوہ شریعت کی بالادستی کو کبھی کسی مسلمان حاکم نے چیلنج نہیں کیا اگرچہ اسلامی احکام پر عمل میں کوتاہیاں ہوتی رہی ہیں اوران پر عمل میں تفاوت بھی رہا ہے۔کہیں زیادہ عمل ہوگیا کہیں کم لیکن شریعت اسلامی ہی ہر مسلم مملکت کا بنیادی قانون رہی ہے اور زندگی کے سارے شعبوں پر وہی مہیمن رہی ہے۔

یہ بھی یادرہے کہ شریعت کی یہ بالادستی انسانوں کو کسی بھی صورت میں منتقل نہیں ہوسکتی۔ مطلب یہ کہ کوئی مسلم حکمران، مسلم شوریٰ، مسلم عوام، مسلم حکومت (یا ریاست) شارع یا سیاسی معنوں میں ساورن نہیں ہوسکتی۔ یہاں تک کہ پیغمبر بھی ان معنوں میں ساورن نہیں ہوتا وہ بھی احکام الٰہی کا پابند ہوتا ہے۔پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اکثر اہل علم 'شارع' ان معنوں میں کہتے ہیں کہ آپ شارعِ حقیقی (یعنی اللہ تعالیٰ) کے کلام کی تبیین وتشریح کرتے ہیں، جہاں وہ مجمل ہو وہ اس کی تفصیل بتاتے ہیں اور جہاں وہ خاموش ہو وہاں اللہ کے دیے ہوئے علم وہدایت کی روشنی میں اس کا تعین کرتے ہیں اور چونکہ وحی جلی اس کی تصویب کے لیے موجود ہوتی ہے لہٰذا جہاں وحی پیغمبر کے کہنے کی تصحیح نہ کرے، وہ گویا اللہ تعالیٰ ہی کا فرمایا ہوا ہے اسی لیے خود حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ [النجم ۵۳: ۳،۴]

۲۔شوریٰ

دوسرا بنیادی اصول جو قرآن وسنت سے ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے سارے اصول باہم مشاورت سے طے ہوں گے۔ نبی کریم ﷺ پر وحی آتی تھی جلی اور خفی بھی۔ اوراس کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو جتنا علم دیا تھا اور جس طرح آپ کی تربیت فرمائی تھی اس میں اغلب یہی تھا کہ آپ صحیح فیصلے فرماتے اور اگر بفرض محال اس میں کوئی کسر رہ جاتی تو وحی جلی اس کی تصویب یا تصحیح کے لیے موجود تھی۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آپ کو مسلمانوں سے مشاورت کا حکم دیتے ہوتے فرمایا﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾[آل عمران ۳: ۱۵۹] جس سے دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی شارع کے پیشِ نظر ہوگا کہ آپ ﷺ کا عمل مسلمانوں کے لیے نمونہ بن جائے اور وہ بھی اپنے اجتماعی معاملات میں مشاورت کا طریقہ اختیار کریں جیسا کہ فرمایا﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾[الشوریٰ ۴۲: ۳۸] اور غالباً اسی وجہ سے آپ ﷺ نے اپنے بعد کسی کو خلیفہ مقرر نہ کیا اور اسے مسلمانوں کی مشاورت پر چھوڑ دیا جنہوں نے باہمی مشورے سے حضرت ابوبکرؓ کو اپنا حاکم چن لیا۔

شوریٰ کے اصول کا تقاضا یہ ہے کہ حاکم (جو فرد واحد ہوتا ہے) مسلمانوں کے امور کا کوئی فیصلہ اپنی ذاتی مرضی سے نہ کرے بلکہ مسلمانوں کی مشاورت سے کرے۔ مشورہ اس کی صواب دید پر منحصر نہیں بلکہ وہ اس کا مکلف ہے، یہ اس کی ذمہ داری ہے۔ اوراس اصول کا تقاضا ہے کہ شوریٰ کی رائے کو حاکم/ امیر کی انفرادی رائے پر ترجیح حاصل ہو گویا امیر شوریٰ کی رائے پر عمل کرنے کا پابند ہے اور اسے شوریٰ کی رائے کو ردّ کرنے کی ویٹو پاور حاصل نہیں ہے الّا یہ کہ وہ ارکان شوریٰ کو بحث واستدلال سے اپنا ہم نوا بنا لے۔

مشورہ کن سے کیا جائے؟

اگرچہ بعد میں آنے والے مسلم علماء نے اس کی تحدید کرنے کی کوشش کی ہے لیکن نبی کریم ﷺ اور خلفاء راشدین کے طرز عمل سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ مشورہ ان سے کیا جائے گا جو دینی احکام کا دوسروں سے زیادہ علم رکھتے ہوں اور وہ ان پر دوسروں سے زیادہ عمل کرتے ہوں۔ جو ذہین ہوں، زیرک ہوں، مدبر ہوں، مسلمانوں میں ان کی رائے وزنی

سمجھی جاتی ہو اور لوگ ان کی رائے کو اہمیت دیتے ہوں، وہ وجہائے قوم میں سے ہوں یعنی خاندان، برادری، قبیلے میں معزز ہوں یا ان کے سربراہ ہوں۔ہم آگے چل کر شوریٰ کے ارکان کے تعین اور طریق کار کا ایک قابل عمل خاکہ پیش کریں گے، ان شاء اللہ۔

۳۔مساوات

اسلام کے سیاسی نظام میں مساوات کا مطلب یہ ہے کہ سارے مسلمان شریعت کی رو سے میں قانونی لحاظ سے برابر ہیں۔حاکم بھی اللہ تعالیٰ کا اسی طرح عبد ہے جس طرح عام مسلمان۔ان میں افضل وہ ہے جو دین کا زیادہ علم رکھتا ہے اور دین پر زیادہ بہتر طریقہ سے عمل کرتا ہو یعنی جو متقی ہو۔[۱] مسلمان حاکم کی حیثیت اللہ اور اس کی شریعت کے آگے ایک عام مسلمان کی سی ہوتی ہے۔اسے کوئی شرعی تقدس حاصل نہیں ہوتا اور وہ احکامِ شریعت پر عمل کا ایک عام مسلمان کی طرف مکلف اور جواب دہ ہوتا ہے اور اس کو تسلیم نہ کرنے کی صورت میں قابلِ عزل ہوتا ہے۔جمہور علماء کی رائے میں افضل کی موجودگی میں غیر افضل کی امامت جائز ہے کیونکہ حکمرانی کے لیے درکار اوصاف ہر انسان میں یکساں موجود نہیں ہوتے اور ضروری نہیں کہ وہ ایک بہت نیک مسلمان میں زیادہ موجود نہ ہوں۔اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا ''خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام۔''[۲] اور اسی لیے آپ ﷺ فتح کے بعد عموماً ان افراد کو عوام پر حاکم باقی رہنے دیتے تھے اگر وہ اسلام قبول کر لیں کیونکہ اس شخص کا حاکم ہونا اس بات پر اغلب ہوتا ہے کہ اچھی حکمرانی کے لیے درکار صفات اس میں موجود ہوں جسے ابن خلدون 'عصبیت' قرار دیتا ہے۔یعنی ذاتی خوبیوں کے علاوہ حکمران خاندان سے ہونا، عاقل اور مدبر ہونا، خاندانی اور نسلی وجاہت رکھنا وغیرہ۔اسی بناء پر آپ ﷺ نے اپنے زمانے میں قریش کو سیاسی قیادت کے لیے اہل تر قرار دیا تھا جس کی صحت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگلے پانچ سو سال تک (بنو امیہ اور بنو عباس کی صورت میں) قریش ہی حکمران رہے۔مطلب یہ کہ اسلامی نظام میں حکمران بننے کا حق وہ رکھتا ہے جو میرٹ پر پورا اُترتا ہو، صلاحیتوں میں برتر ہو، حکمرانی کے لیے درکار اہلیت دوسروں سے افضل ہو اور صالح و متقی بھی ہو۔

---

[۱] اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ (الحجرات ۴۹: ۱۳)
[۲] صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۳۳۸۳

۴۔عدل

اسلام عدل کا علمبردار ہے۔ وہ صرف انفرادی زندگی ہی میں عدل وانصاف کی تلقین نہیں کرتا بلکہ عدل اجتماعی کی بھی بات کرتا ہے وہ عدالتوں میں عدل کا مطالبہ کرتا ہے، معیشت میں عدل کا مطالبہ کرتا ہے کہ کسی سے ناانصافی نہ ہو، کسی کا حق نہ مارا جائے۔ وہ معاشرت میں عدل کی بات کرتا ہے کہ کوئی کمزور عدل سے محروم نہ ہو۔ کوئی بچہ، کوئی عورت، کوئی غریب، کوئی کمزور عدل سے محروم نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے کائنات کا سارا نظام عدل پر قائم کر رکھا ہے ﴿وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ﴾ [الرحمن ۵۵:۷] لٰہذا کسی انسان کو حق نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تعلیمات کو ردّ کر دے، زمین میں فیصلے بے انصافی سے کرے اور اللہ تعالیٰ کے نظام عدل اور اس کے قائم کیے ہوئے توازن کو مجروح کرنے کا سبب بنے، زمین میں مَن مانی کرے، اپنی مرضی کرے اور اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے احکام کی، جو عدل اور توازن کی ضمانت ہیں، خلاف ورزی کرے۔ ﴿اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ﴾ [الرحمن ۵۵:۸] اسلام سیاسی لحاظ سے بھی عدل وتوازن کا خواہاں ہے اور اس میں بے اعتدالی اور ظلم وجور کو پسند نہیں فرماتا۔ لٰہذا مسلمان حکمرانوں پر واجب ہے کہ اسلامی تعلیمات افراد اور معاشرے پر نافذ کریں اور اسلامی احکام کی خلاف ورزی کر کے بے انصافی کے مرتکب نہ ہوں۔

۵۔خلافت/عبدیت

قرآن حکیم کے مطابق ہر انسان/مسلمان اللہ کا عبد ہوتا ہے ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ [الذاریات ۵۱:۵۶]۔ لٰہذا ہر مسلم حکمران بھی، ایک عام مسلمان کی طرح، اللہ کا عبد ہوتا ہے۔ وہ ماضی کے حکمرانوں کے دعووں کی طرح نہ تو اللہ کا نمائندہ ہوتا ہے اور نہ اسے کوئی تقدیس حاصل ہوتی ہے۔ نہ وہ ہمہ مقتدر بادشاہ یا شہنشاہ ہوتا ہے کہ اپنی مرضی سے جو چاہے، کرے نہ مغرب کے جاہلانہ تصورِ حاکمیتِ عوام کی طرح وہ خود مختار عوام کا نمائندہ اور خود مختار حاکم ہوتا ہے بلکہ وہ اللہ کا عاجز بندہ ہوتا ہے۔ اس میں اور ایک عام مسلمان میں صرف یہ فرق ہوتا ہے کہ مسلمان عوام اسے باہم مشورے سے اپنا امیر/حاکم چن لیتے ہیں

تا کہ وہ امورِ مملکت اللہ کے حکم اور شریعت کے مطابق ادا کرے اور انہیں شریعت پر چلائے۔

مسلمان حاکم/ امیر/ سردار/ رئیس کو مسلم روایت میں 'خلیفہ' کہا جاتا ہے[۱] اسلام کی رو سے، درحقیقت ہر انسان اللہ کا خلیفہ ہوتا ہے۔ عربی زبان میں لفظ خلیفہ کا اصل مفہوم وہ شخص ہے جو کسی کے بعد آئے اور اس کے اختیارات کو استعمال کرے۔ اللہ تعالیٰ نے جب آدم کو پیدا کیا تو اسے خلیفہ قرار دیا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے دو طرح کے اختیارات سے نوازا تھا۔

ایک اختیار اسے یہ دیا کہ وہ چاہے تو اللہ کو مانے اور چاہے تو نہ مانے (یعنی اسے جمادات وحیوانات کی طرح تکوینی طور پر اپنا تابع نہیں بنایا بلکہ اسے اختیار کی آزادی دی۔ اگرچہ اس اختیار کے غلط استعمال کا نتیجہ بھی بتادیا کہ اس سے زمین میں فساد پھیلے گا اور وہ آخرت میں جہنم کی سزا کا مستحق ہوگا۔ دوسرا اختیار یا قوت اسے یہ دی کہ اسے علم الاسماء یا دُنیا کا علم عطا فرمایا اور دنیا کو اس کے لیے بنایا اور اس کے تابع کیا تا کہ وہ اسے استعمال کر سکے لیکن یہاں بھی اسے بتادیا کہ وہ درحقیقت معرضِ آزمائش میں ہے اگر وہ اپنے اختیار کو اللہ کی مرضی وہدایت کے مطابق استعمال کرے گا تو کامیاب ہوگا اور اگر اس نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی خلاف ورزی کی تو جہنم کے عذاب کا مستحق ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو 'خلیفہ' اس لیے بھی قرر دیا کہ اس نے اس طرح کی صاحبِ اختیار مخلوق یعنی جِنّ پہلے بھی پیدا کر رکھی تھی اور انسان کو اس کے بعد پیدا کیا۔ ہمیں ان لوگوں کی رائے صحیح نہیں لگی جو لفظ خلیفہ کا مفہوم 'اللہ کا نائب' کے طور پر کرتے ہیں کیونکہ اللہ کو نہ کسی نائب کی ضرورت ہے اور نہ کوئی اس کا نائب ہوتا ہے۔ انسان چونکہ اصلاً اللہ کا عبد ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کا اپنے عبد کو کچھ اختیار دینا اس کا امتحان اور آزمائش ہے نہ کہ شرف ومنصب۔ جیسا کہ فرمایا کہ ﴿الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ [الملک ۶۷:۲]

قرآن وسنت کے ان اصولوں پر مسلمانوں نے کیسے عمل کیا اور کیسے اسے ایک باقاعدہ نظام کی شکل دی؟ یہ بیان کرنے سے پہلے ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اسلام میں حکومت ومملکت

---

[۱] جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ .....﴾ (النور ۲۴:۵۵)

کے مقاصد واہداف کی طرف مختصر اشارہ کر دیا جائے۔

اسلامی مملکت کے مقاصد

اسلامی مملکت کے بنیادی مقاصد میں یہ بات شامل ہے کہ وہ شریعت کو عملاً نافذ کرے اوراس پر عمل کرائے۔فرد کوایسی تعلیم وتربیت اور ماحول دے کہ ان کے لیے دین پر عمل آسان ہوجائے۔ وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کرے، نظامِ صلاۃ وزکوٰۃ قائم کرے،سارے شعبہ ہائے زندگی کواسلامی تعلیمات کے مطابق چلائے اور دارالاسلام کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لیے ضروری اقدامات کرے۔مسلمانوں میں تفرقے کو روکے،ان میں اتحاد پیدا کرے اور وحدتِ امت کے تصور کو فروغ دے۔

خلیفہ/ خلافت مسلم تاریخ میں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں نے باہمی مشاورت سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنا حاکم چن لیا تو وہ انہیں خلیفۃ الرسول کہنے لگے کیونکہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد حاکم بنے تھے(روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ ایک دفعہ کسی نے ان کو’خلیفۃ اللہ‘ کہا تو انہوں نے جواب دیا کہ بھائی میں’خلیفۃ اللہ‘نہیں’خلیفۃ الرسول‘ہوں)اور وہ ہر مسلمان حاکم کی طرح شرع اللہ کے پابند تھے،مطلق العنان حکمران نہ تھے۔لیکن جب حضرت عمرؓ کو خلافت ملی اور کسی نے انہیں’’خلیفۃُ خلیفۃِ الرسول‘‘ کہا تو انہیں یہ غیر مناسب لگا کیونکہ آنے والے ہر مسلمان حاکم کے لیے لفظ’خلیفہ‘ کا اس طرح استعمال کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے صحابہ کرام کے مشورے سے’خلیفہ‘ کی بجائے’امیر المومنین‘ کا لقب اختیار کرلیا۔گویا ہر مسلمان حاکم مسلمانوں کا امیر ہوتا ہے جس کی تقرری مسلمانوں کے مشورے اور ان کی موافقت سے ہوتی ہے۔اس زمانے کے دستور کے مطابق مسلمان حاکم کو منظور کرنے کے مظہر کے طور پر اس سے مصافحہ کرتے تھے جسے’بیعۃ‘(اردو میں بیعت) کہا جاتا تھا جس کی اصل یہ تھی کہ اس وقت عربوں میں خرید وفروخت (بیع وشراء) میں موافقت کے اظہار کا طریقہ فریقین کا آپس میں مصافحہ کرنا تھا۔اس اظہارِ موافقت کو سیاسی مفہوم میں’بیعۃ‘(یا بیعت) کہا جانے لگا)۔گویا خود حضرت عمرؓ نے’خلیفہ‘ کے لفظ یا اصطلاح کو بدل کر اسے’امیر المومنین‘ کر

دیا۔ با الفاظِ دیگر انہوں نے 'خلافت' کو 'امارت' سے بدل دیا۔ لہٰذا مسلمانوں کی حکومت کو 'خلافت' کے مقابلے میں 'امارت' کہنا زیادہ موزوں ہے لیکن مسلم روایت اور تاریخ میں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ دورِ مابعد میں مسلمان حاکم کو اکثر 'خلیفۃ المسلمین' کہا جانے لگا اور 'امارت' کے مقابلے میں 'خلافت' کا لفظ یا اصطلاح زیادہ مشہور ہوگئی۔ مفہوم اس کا یہ تھا کہ مسلمانوں کے نظامِ حکومت میں امیر/ خلیفہ مختارِ مطلق اور خودسر و ہمہ مقتدر نہیں ہوتا کہ وہ جو چاہے کرے اور جیسے چاہے حکومت چلائے بلکہ وہ اللہ کا عبد ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی تعلیمات و احکام کا پابند ہوتا ہے اور اسلامی شریعت کے مطابق حکومت کا نظام چلاتا ہے۔

رفتہ رفتہ 'خلافت' کا ادارہ مسلمانوں کی سیاسی مرکزیت کے مظہر کے طور پر بھی مشہور ہوگیا کیونکہ دورِ صحابہؓ میں کثرتِ فتوحات سے بہت سی حکومتیں مسلمانوں کے زیرِ نگیں آگئیں جنہیں صوبے کہا جانے لگا۔ یہ صوبے اور ان کے حکمران کافی حد تک داخلی خودمختاری رکھتے تھے لیکن بہرحال مرکزی حکومت یا خلافت/ امارت کے تابع ہوتے تھے۔ اسی طرح بعد میں بہت سے مسلمان حکمران بڑی حد تک سیاسی اور انتظامی لحاظ سے خودمختار ہوگئے لیکن اس کے باوجود وہ خلیفہ کی مرکزی حیثیت کو تسلیم کرتے خواہ وہ محض رسمی (یعنی Symbolic) ہی کیوں نہ ہو (اگرچہ بعض جگہ مسلم حکمرانوں نے اس کی بھی ضرورت نہ سمجھی اور خود کو ملک، سلطان یا بادشاہ کہلانے لگے لیکن تاریخ میں اس کی مثالیں بہت تھوڑی ہیں اور اکثریت یا جمہور کا مؤقف یہی ہے کہ خلافت مسلمانوں کے اقتدار کا مرکز تھی۔

اس تفصیل کا مقصد یہ بتانا تھا کہ اگر مسلمانوں کے نظامِ حکومت کو مسلم روایت کے طور پر 'خلافت' تسلیم کر بھی لیا جائے تو آج جب کہ استعمار نے مسلمانوں کی حکومتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے (شام مسلمانوں کا ایک بڑا ملک تھا اب اس کو پانچ ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے یعنی فلسطین، شام، لبنان، اردن اور عراق و مصر کے بعض علاقے) تا کہ وہ کمزور رہیں اور پہلی جنگ عظیم کے بعد مغربی استعمار نے اپنے ایجنٹ مصطفیٰ کمال پاشا سے یہ معاہدہ کیا (یا کرایا کہ شکست خوردہ کی کیا مرضی ہوتی ہے؟) کہ وہ خلافت کو ختم کر دے گا اور یہ کہ ترکی کا نظامِ حکومت آئندہ مغربی طرز پر سیکولر و لبرل ہوگا، خلافت پر مبنی نہیں ہوگا۔ چنانچہ آج کسی مسلم ملک

کو، اگر وہ مغربی استعمار کے چنگل سے نکل بھی جائے تو اسے خود کو 'امارت' ہی کہلانا چاہیے نہ کہ 'خلافت' کیونکہ خلافت تو اس وقت قائم ہو گی جب سارے مسلم ممالک مل کر 'خلافت' کو اختیار کرنے پر آمادہ ہو جائیں یعنی اسے سارے مسلمان حکومتوں کی تائید وحمایت حاصل ہو۔ ظاہر ہے اس وقت جو عملی صورتِ حال ہے اس میں دنیا کے سارے مسلم ممالک مغربی استعمار کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے ہیں اور وہ فکری اور عملی طور پر مغربی استعمار کے غلام ہیں، وہ مغربی استعمار جس کا نظامِ حکومت کفر پر مبنی ہے۔ اسی لیے افغانستان کے حکمرانوں نے جب چالیس سال تک جہاد کر کے پہلے روسی اور پھر امریکی (اور اس کے حلیف یورپی/ نیٹو بلکہ بین الاقوامی ممالک کہ افغانستان میں امریکہ کے ۴۸ حلیف ممالک بشمول ترکی جیسا مسلم ملک بھی شامل تھے) استعمار کو شکست دی تو انہوں نے اپنے ملک کو 'خلافت' کی بجائے 'اسلامی امارت' قرار دیا۔ اس کے برعکس شام اور عراق کے بعض علاقوں پر جب مجاہدین کے ایک گروپ نے قبضہ کر لیا تو انہوں نے 'داعش' کے نام سے 'خلافت' قائم کرنے کا اعلان کیا تو کسی مسلمان ملک نے اس 'خلافت' کو تسلیم نہیں کیا اور وہ تماشا بن کر رہ گئی بلکہ مغربی استعمار نے ان کی دہشت گردی اور مظالم کے ایسے ایسے جھوٹے اور مکروہ شاہکار تخلیق کیے اور ان کے خلاف اتنا شدید جھوٹا پروپیگنڈا کیا کہ داعش کو دنیا میں دہشت گردی کا ناقابل قبول سمبل (Symbol) بنا دیا، اگرچہ بعد میں خود مغرب کے کئی بڑوں نے خود تسلیم کیا کہ یہ مجاہدین گروپ خود ان کا تیار کردہ تھا اور خود انہوں نے ان سے 'خلافت' کا نعرہ لگوایا تھا تا کہ آئندہ کوئی مسلم ملک 'خلافت' کا نام استعمال کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ مملکت خداداد پاکستان جو آج مغربی پنجوں میں جکڑا ہونے کی وجہ سے 'اسلامی جمہوریہ پاکستان' بنی ہوئی ہے، اگر مغرب کی فکری وعملی غلامی سے کبھی نکل بھی جائے (جس کا کوئی فوری امکان نظر نہیں آتا کیونکہ پاکستان کی دینی سیاسی جماعتوں نے اپنی کوتاہیٔ فکر سے مغرب کے کافرانہ جمہوری نظام کو اسلامی لبادہ پہنا کر اسے 'اسلامی جمہوریت' کہہ کر قبول کر رکھا ہے حالانکہ اسلام اور کفر میں یہ مفاہمت نظری طور پر بھی ممکن نہ تھی اور عملاً بھی وہ پون صدی کی جدوجہد کے باوجود ناکام ہو چکی ہے) تو وہ خود کو 'امارتِ اسلامی' ہی

کہلائے گی اور یہ گویا پہلا زینہ ہوگا 'اسلامی خلافت' کا۔

پاکستان میں شوریٰ، اجتہاد، انتظامیہ اور عدلیہ کا عملی خاکہ

پاکستان میں مغربی طرز کی جمہوریت، انتخابات، اسمبلیوں، مقننہ، عدلیہ، انتظامیہ، سیاسی جماعتوں کے اسلامی متبادلات کیا ہو سکتے ہیں؟ ان کا ایک عملی خاکہ ذیل میں دیا جا رہا ہے:

۱۔ پاکستانی عوام کی دین سے دوری، اخلاقی بحران، تعلیم کی کمی اور غربت کی وجہ سے ہماری تجویز یہ ہے کہ پاکستان کے سیاسی نظام میں مشاورت کی زیریں ترین سطح مسجد کے نمازیوں پر مشتمل ہو (جن کے بارے میں یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ تزکیۃ الشہود کی کم از کم قابلِ قبول سطح کے حامل ہو سکتے ہیں) وہ اپنے گلی محلے کے لوگوں سے بھی مشورہ کر لیں اور لوکل وصوبائی شوریٰ کے ارکان کا انتخاب کریں۔

۲۔ ہماری تجویز یہ بھی ہے کہ پاکستان میں انتظامی طور پر ۹ صوبے بنا لیے جائیں۔ پنجاب کے تین (شمالی، وسطی وجنوبی) صوبہ سرحد کے دو (ہزارہ اور خیبر)، سندھ کے دو (کراچی واندرون سندھ) اور بلوچستان کے دو (بولان و گوادر)۔

ان صوبوں کو داخلی خودمختاری دے دی جائے۔ ان کی اپنی اپنی شوریٰ ہو، حکومت ہو البتہ دفاع، تجارت، کرنسی، خارجہ تعلقات مرکز کے پاس ہوں۔ ہر صوبے کا ایک والی/ گورنر ہو جو انتظامی سربراہ ہو (وزیرِاعلیٰ کی ضرورت نہیں) جسے شوریٰ منتخب کرے۔ اسی طرح لوکل سطح پر ہو جسے آج کل لوکل گورنمنٹ کہا جاتا ہے، کہ ارکان شوریٰ اپنے میں سے کسی کو شہر، تحصیل، ضلع کا ناظم مقرر کر لیں۔

۳۔ ہر صوبے کی شوریٰ اپنے پانچ بہترین آدمی مرکزی شوریٰ کے لیے چنے۔ اس طرح مرکزی شوریٰ میں ۴۵ ارکان ہوں جو سارے صوبوں سے ہوں۔ یہ شوریٰ اپنے میں سے ایک آدمی کو رئیس مملکت منتخب کرے جو انتظامی سربراہ ہو (وزیرِ اعظم نہ ہوگا) البتہ صدرِ مملکت حسب ضرورت وزراء کا تقرر کر سکتے ہیں۔ ہر سطح پر شوریٰ کا اختیار ہوگا کہ وہ انتظامی سربراہ کے کام کی نگرانی کرے اور اسے کام کرنے کے لیے تجاویز دے۔ ہر سطح کا ناظم/ گورنر/ صدرِ مملکت شوریٰ کو جواب دہ ہوگا اور اس کے فیصلوں کا پابند ہوگا اور اسے شوریٰ کے فیصلوں کو ردّ کرنے کا اختیار

نہ ہوگا۔

خلافتِ راشدہ کے زمانے میں انتظامی اختیارات امیر المومنین کی ذات میں مرتکز تھے لیکن اب اخلاقی انحطاط کی وجہ سے چونکہ ابوبکر وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم جیسے افراد میسر نہیں لہٰذا بہتر ہے کہ اختیارات کا مرکز شوریٰ کو بنا دیا جائے تا کہ اختیارات کے غلط استعمال کے امکانات کم سے کم ہوجائیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ خلیفہ/ امیر المومنین کی ذات میں اختیارات کی مرکزیت کوئی شرعی حکم نہ تھا بلکہ اس وقت تک کے انسانی اور سیاسی تجربات کا حاصل تھا۔ آج حالات بدل گئے ہیں لہٰذا امیر/ خلیفہ/ صدر مملکت کو کلی اختیارات کا مالک بنانا خلافِ مصلحت ہوگا۔

ہر شوریٰ اپنا سربراہ خود چنے گی (جسے آج کل سپیکر کہا جاتا ہے) وہ شوریٰ کے اجلاسوں کی صدارت کرے گا اور صدر/ گورنر/ ناظم شوریٰ کی صدارت نہ کرے گا۔

۴۔ اجتہاد کمیٹی: مرکزی شوریٰ پورے ملک سے ایسے ۹ آدمی چنے گی (اگر ہوسکے تو ہر صوبے سے ایک لیکن یہ لازمی نہ ہوگا) جو دین کے عالم ہوں [۱] اور جن میں بظاہر اجتہاد کی صفات پائے جانے کا احتمال ہو جیسے وہ علومِ قرآن وسنت کے ماہر ہوں، عربی زبان پر اور فقہ واصولِ فقہ میں دسترس رکھتے ہوں۔ معاصر دنیا کا فہم اور معاصر علوم سے واقفیت بھی انہیں حاصل ہو۔ اجتہاد کمیٹی کے ارکان منتخب ہونے کے بعد باہمی مشاورت سے اپنے میں سے ایک کو انتظامی سربراہ چن لیں اور چند اسلامی ذہن کے قانون دانوں کو بھی اجتہاد کمیٹی کا رکن بنالیں۔

طریق کار یہ ہو کہ جن نئے قواعد وضوابط [قوانین] کے بنانے کی ضرورت ہو، متعلقہ وزارت یا کوئی رکن شوریٰ اس کا مسودہ شوریٰ میں پیش کرے۔ شوریٰ میں عمومی بحث کے بعد وہ معاملہ اجتہاد کمیٹی کو بھجوا دیا جائے۔ اجتہاد کمیٹی اس کی جو صورت تجویز کرے وہ حتمی ہوگی۔ شوریٰ یا رئیس مملکت اس کو نظر ثانی کے لیے اجتہاد کمیٹی میں واپس بھجوا سکتے ہیں یا متبادل تجاویز دے سکتے ہیں لیکن اجتہاد کمیٹی کا فیصلہ ہی حتمی تصور ہوگا۔ یاد رہے کہ اجتہاد کمیٹی کے ارکان شوریٰ کے ممبر ہوں گے۔ ہر اجتہادی ضابطے کے نفاذ کی حتمی منظوری رئیس مملکت دیں گے۔

---

[۱] دین کے عالم سے مراد ہر وہ شخص ہے جو دینی علوم کا ماہر ہو۔ اس کے لیے معروف معنوں میں ’مولوی‘ یا ’فاضلِ درس نظامی‘ ہونا ضروری نہیں اگرچہ یہ ڈگری دینی علم رکھنے کا قرینہ ضرور ہے۔

تاہم جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ وہ اجتہاد کمیٹی کے فیصلوں کو ردّ نہیں کر سکیں گے۔

۵۔ ارکان شوریٰ کی اہلیت: ہر سطح پر ارکان شوریٰ وہ اشخاص ہوں گے جو دین و دنیا کا ضروری علم رکھتے ہوں اور اپنے تدبر، کردار اور حسنِ اخلاق میں نیک نام ہوں۔ صادق وامین ہونے کا تاثر رکھتے ہوں اور صالح ونیکو کار ہونے کی شہرت رکھتے ہوں۔ نیز احکامِ شریعت سے تغافل اور ان پر عمل نہ کرنے کے حوالے سے مشہور نہ ہوں یا جرائم میں ملوث نہ ہوں۔

۶۔ ہر سطح پر شوریٰ کی ورکنگ کا اصول یہ ہوگا کہ ارکان میں اتفاق رائے کی پوری کوشش کی جائے گی تاہم اختلاف برقرار رہنے کی صورت میں اکثریت کی رائے پر فیصلہ ہوگا۔

۷۔ مترفین یعنی سرمایہ دار اور جاگیر دار (جنہیں آج کل کی سیاسی اصطلاح میں الیکٹ ایبلز کہا جاتا ہے) اور جو آج تک پاکستان میں اسلام مخالف جمہوری نظام میں فساد و بگاڑ کا بنیادی سبب ہیں، ہمارے تجویز کردہ نظام میں ان کا کوٹا معاشرے میں ان کی تعداد کے لحاظ سے ہر سطح کی شوریٰ میں مقرر ہوگا۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ یہ ایک فیصد ہوتا کہ وہ ماضی کی طرح عامۃ الناس کے حقوق غصب نہ کر سکیں۔ نیز وہ صدر مملکت/ گورنر/ ناظم یا کسی بھی سطح کی شوریٰ کے سپیکر بننے کے اہل نہ ہوں گے۔ اس طرح غریب اور متوسط طبقے کے شرفاء ارکانِ شوریٰ منتخب ہو کر تعمیری کردار ادا کر ہو سکیں گے۔

۸۔ اس مجوزہ نظام میں شوریٰ کے کسی رکن کو کنویسنگ کی اجازت نہ ہوگی، نہ کوئی خود کو شوریٰ کا رکن بننے کے لیے پیش کرے گا یا اس کے لیے کوشش کرے گا اور نہ اس کے لیے پیسے خرچ کرے گا بلکہ ایسا کرنا اس کی نااہلی اور شوریٰ کے لیے غیر مناسب ہونے کا ثبوت ہوگا چنانچہ اسے شوریٰ کا رکن منتخب نہیں کیا جائے گا۔ اس طرح شوریٰ کا رکن منتخب ہونے کے لیے پیسوں، اثر ورسوخ اور خاندان، برادری کے استعمال کا رجحان بھی ختم ہو جائے گا، ان شاء اللہ۔

۹۔ جو ارکان شوریٰ ملازمت پیشہ ہوں، آجر انہیں شوریٰ کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی باتنخواہ اجازت دے گا۔ جو ارکانِ شوریٰ غریب اور متوسط طبقے کے ہوں، ان کو آنے جانے اور رہائش کے لیے اتنا معاوضہ دیا جائے گا جتنا پاکستان کے ایک متوسط درجے کے شہری کا خرچ ہوتا ہے۔ یہی معاملہ ناظمین، گورنروں، رئیس مملکت اور سپیکروں کا ہوگا کہ اگر ان کو تنخواہوں کی

ضرورت ہو تو ان کا یومیہ روزینہ اور ماہانہ تنخواہ اتنی مقرر ہو گی جتنی ایک متوسط طبقے کے پاکستانی کی ہوتی ہے۔ موجودہ ہوش ربا تنخواہوں اور مراعات کو ختم کر دیا جائے گا، چنانچہ رکنِ شوریٰ ہونا ذمہ داری اور مشقت کا کام ہو گا نہ کہ عیش وعشرت اور کمائی کا ذریعہ۔

۱۰۔ مرکزی شوریٰ خواتین پر مشتمل ایک خصوصی شوریٰ کا تقرر کرے گی۔ ارکانِ شوریٰ خواتین سے متعلق مسائل کے حل یا قواعد سازی کی تجاویز اجتہاد کمیٹی کو بھجوائیں گی جن کی منظوری کا طریق کار وہی ہو گا جو اوپر ذکر ہو چکا۔

۱۱۔ امارت اسلامی پاکستان میں مرد وخواتین، مسلم وغیر مسلم، حاکم ورعایا سب کے حقوق وفرائض وہی ہوں گے جو قرآن وسنت میں مذکور ہیں۔

۱۲۔ ضلعی، صوبائی اور مرکزی ہر سطح کے عدالت کے جج انہی صاحبان کو مقرر کیا جا سکے گا جو قرآن وسنت، فقہ واصول فقہ اور عربی زبان کے ماہر ہوں اور جدید قوانین اور اصولِ قانون سے واقف ہوں۔ پاکستان میں قانون کی تعلیم کو تبدیل کر دیا جائے گا تا کہ اس صلاحیت کے حامل افراد تیار ہونا شروع ہو جائیں۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا ہر سطح کے ججز کی اسلامی علوم میں ٹریننگ کا انتظام کیا جائے گا اور ہر جج کے ساتھ ایک مفتی کا تقرر کیا جائے گا جس کی عملی شمولیت کے بغیر جج فیصلہ نہیں کر سکے گا۔

۱۳۔ ہر عدالت، حاکم (ایگزیکٹو)، شوریٰ کا فیصلہ اس بنیاد پر ’آئینی عدالت‘ میں چیلنج کیا جا سکے گا کہ وہ خلافِ شریعت ہے۔ اگر اجتہاد کمیٹی کے کسی فیصلے کو اس بنیاد پر چیلنج کیا جائے تو فل کورٹ اس کو ریویو کرے گی، اجتہاد کمیٹی کا مؤقف سنے گی اور اپنی تجاویز نظر ثانی کے لیے اجتہاد کمیٹی کو بھجوائے گی۔

۱۴۔ اس تحریر میں دی گئی تجاویز کو حسبِ ضرورت قانونی و دستوری اسلوب میں لکھا جا سکتا ہے۔

اس سیاسی نظام پر عمل درآمد

اسلام کے جس سیاسی نظام کا نقشہ سطور بالا میں کھینچا گیا ہے اس پر عمل سے پہلے ضروری

ہے کہ اسے ملک کے علماء کرام ، سکالرز اور اہل دانش کے سامنے پیش کیا جائے اور بحث ومناقشے کے بعد ان سے ان کی منظوری لی جائے۔ پھر اسے ملک کی دینی اور سیاسی جماعتوں کو پیش کیا جائے تا کہ وہ اس کے نفاذ کا سوچیں۔ اسے عوام وخواص سب کے علم میں لا یا جائے تا کہ ان سے اس کی تائید حاصل کی جا سکے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام ایک اکائی ہے اور اسلامی نظامِ زندگی ایک وحدت ہے۔ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس پر اس طرح عمل درآمد کیا ہی نہیں جا سکتا کہ کسی ایک شعبے پر تو اسلام نافذ کر دیا جائے یا اسے اسلامی تقاضوں کے مطابق بدل دیا جائے لیکن باقی کے شعبے بدستور غیر اسلامی بنیادوں پر کام کرتے رہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ زندگی کے سارے شعبوں کی بیک وقت اسلامی تناظر میں اصلاح کی جائے اور ﴿اُدۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً﴾ کے اصول پر سارے اسلامی اصولوں پر بیک وقت عمل کیا جائے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں اس وقت نظامِ تعلیم وتربیت، میڈیا، سیاسی ومعاشی حالات، قانون وعدالت، اور دینی تعلیم وتربیت کا جو حال ہے اس کی موجودگی میں اسلام کے اس مجوزہ سیاسی نظام پر عمل ہوتا نظر نہیں آتا؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ تعلیم وتربیت کے موجودہ نظام کو بدلا جائے، جدید تعلیم ہی نہیں دینی تعلیم، میڈیا اور تزکیۂ نفس کے احوال کی بھی اصلاح کی جائے تا کہ ایسے افراد تیار ہونا شروع ہو جائیں جو صحیح اسلام کو سمجھتے بھی ہوں اور اس پر عمل بھی کرنا چاہتے ہوں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ملک کے نظامِ معیشت، نظامِ عدالت، نظامِ معاشرت اور نظامِ قانون کو بھی بدلا جائے۔ چونکہ یہ کام اوپر سے اچانک نہیں لادا یا تھونپا جا سکتا لہٰذا ضروری ہے کہ اس حوالے سے موجودہ نظاموں کی اصلاح کی جائے۔ کیا اصلاح کی جائے اور کیسے اصلاح کی جائے؟ اس کا جواب ہم سطورِ ذیل میں دیں گے اور ہر نظام میں مطلوب تبدیلیوں کا ذکر کریں گے:

نظامِ تعلیم وتربیت

۱۔ ہماری تعلیم کا ایک بنیادی مسئلہ ثنویت ہے یعنی دینی تعلیم الگ (جس میں دنیاوی علوم ومعارف موجود نہیں) اور دنیاوی تعلیم الگ (جس میں مذہبی تعلیم وتربیت کا اہتمام

نہیں) جبکہ اسلام موحّد (Integrated) نظامِ تعلیم کا علمبردار ہے جس میں دینی و دنیاوی تعلیم و تربیت دونوں بیک وقت موجود ہوں۔ پاکستان میں جب اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو اسے نیا موحد نظام تعلیم قائم کرنا چاہیے۔ فی الحال اس بات کی وضاحت کے لیے کہ موجودہ عصری تعلیم اور دینی مدارس کی تعلیم میں کیا خامیاں ہیں جنہیں دور کیا جانا چاہیے، سطورِ ذیل میں ان کا ذکر الگ الگ کر دیا گیا ہے۔

۲۔ اس بات کو اگر ہم عصری تناظر میں لیں تو رسمی تعلیم کے ساتھ دعوت، تبلیغ، ذرائع ابلاغ (میڈیا) کو بھی تعلیم کا حصہ سمجھا جا سکتا ہے اور تربیت اور اصلاح شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو بھی تزکیۂ نفس گردانا جا سکتا ہے۔ لہٰذا آج کے پاکستان میں تعلیم، دعوت و تبلیغ، میڈیا، تربیت اور تزکیۂ نفس کے شعبوں میں کن اصلاحی اقدامات کی ضرورت ہے، پہلے ہم انہیں بیان کریں گے:

عصری تعلیم (تدریس، تحقیق، تربیت)

تدریس

ا۔ تعلیم و تدریس میں بنیادی چیز اسلامی عقائد کی تدریس ہے کیونکہ اعمال کا سارا مدار عقائد کی صحیح تعلیم ہی پر ہے۔ اس وقت 'عقیدے' کے نام پر دینی مدارس میں عقیدہ طحاویہ اور بعض جگہ عقیدہ نسفیہ بھی پڑھایا جاتا ہے اور عصری سکولوں میں اسلامیات کی مختصر کتاب میں عقائد کے نام پر دو تین صفحے پڑھا دیے جاتے ہیں، جبکہ عقائد سے ہماری مراد توحید، رسالت اور آخرت ہیں۔ عصری تعلیم ہو یا دینی دونوں میں عقائد کی تدریس پر فوکس ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ جب تک توحید، رسالت اور آخرت کی تعلیم پر اس طرح ترکیز نہ ہو کہ وہ محرکِ اعمال بن جائیں، محض دو تین صفحات پڑھا دینے سے یا کلامی سطح پر بڑی عمر کے بچوں کو عقیدہ طحاویہ وغیرہ پڑھا دینے سے زیادہ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے سکولوں میں ابتدائی جماعتوں میں قرآن و سنت اور اسلامیات یا دینیات کے نام پر جو نصابات ہمارے ہاں مروج ہیں ان میں عقائد کو بنیادی اہمیت دی جانی چاہیے اور انہیں موٹیویشنل انداز میں بار بار اس طرح تفصیل سے پڑھانا چاہیے کہ وہ تعمیرِ شخصیت کی بنیاد بن جائیں، ان کے نتیجے میں مسلمان بچوں کا ایمان پختہ

ہو جائے جو اعمالِ صالحہ پر منتج ہو۔ بڑی عمر میں جا کر بچوں کو ان عقائد کی اہمیت عقلی اور متکلمانہ انداز میں سمجھائی جا سکتی ہے۔

۲۔ ملک کے موجودہ تعلیمی نظام کو لارڈ میکالے کی سفارشات اور پیروئ مغرب کے اثراتِ بد سے نکالنے اور اسلامی اصولوں پر قائم کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ اس کے لیے پہلے ماڈل سکول/ کالج/ یونیورسٹی/ مدرسہ بنانے کی کوشش کی جائے۔

یاد رہے کہ اس کے لیے اسلامیات/ دینیات کا ہلکا پھلکا مضمون کافی نہیں بلکہ سارے علوم اور تعلیمی نظام کی اسلامی تشکیلِ نو ناگزیر ہے۔ علوم کی تشکیلِ نو میں عمرانی اور سائنسی علوم کے ساتھ اسلامی علوم کی تدوینِ نو بھی شامل ہے۔

۳۔ قرآن حکیم ناظرہ، تجوید، ترجمہ اور تفسیر کو نصاب کا حصہ بنایا جائے۔ احادیث کے متن کی تدریس بھی جزوِ نصاب ہو۔ دینیات/ علوم اسلامیہ کے موجودہ مختصر نصاب کی بجائے دینی علوم کی تعلیم کا وسیع انتظام ہونا چاہیے۔

۴۔ ملک سے تعلیمی ثنویت اور طبقاتی نظامِ تعلیم ختم کرنا: تعلیمی ثنویت سے مراد ہے دینی اور دنیوی تعلیم کا الگ الگ ہونا اور طبقاتی نظامِ تعلیم سے مراد ہے امیروں اور غریبوں کے لیے اور مغرب زدہ لوگوں اور عام لوگوں کے لیے الگ الگ تعلیمی نظام ہونا۔

۵۔ تعلیم کو مغرب کی الحادی فکر و تہذیب سے بچانے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کرنا:

i۔ انگریزی کا بطور لازمی مضمون خاتمہ۔ پرائمری کے بعد اسے بطور اختیاری مضمون پڑھایا جائے۔ پبلک سروس اور سی ایس ایس کے امتحانات میں بھی انگریزی اختیاری مضمون ہو۔

ii۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم کا خاتمہ اور سارے پاکستان میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانا (تاہم مقامی زبانوں کو پرائمری میں بطور لازمی مضمون پڑھایا جا سکتا ہے)۔ اردو پاکستان کی قومی، دفتری اور عدالتی زبان ہونی چاہیے۔ اس کی خلاف ورزی فوجداری جرم ہونا چاہیے جس پر سخت سزا ہو۔

iii۔ غیر ملکی نصابات اور امتحانات (او لیول اور اے لیول وغیرہ) کا خاتمہ

iv۔ مخلوط تعلیم کا خاتمہ: طلبہ اور اساتذہ دونوں میں۔ طالبات کے تعلیمی ادارے سکول سے لے کر یونیورسٹی تک الگ ہونے چاہئیں اور ان میں مرد اساتذہ اور مردانہ سٹاف ممنوع ہو۔

v۔ پری سکول میں انگریزی کی تدریس نہ ہو۔ پری سکول صرف ایک سال کا ہو جس میں داخلے کے وقت بچے کی عمر ۵ سال ہو۔ اس میں قرآنی قاعدہ، اردو، ابتدائی حساب اور تعلیمِ اخلاق کے علاوہ کوئی کتاب نہ ہو۔

۶۔ طالبات کے سارے نصابات سکول سے لے کر یونیورسٹی تک طلبہ کے نصابات سے مختلف اور ان کی صنفی ضروریات کے مطابق ہونے چاہئیں۔

۷۔ مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کا تنقیدی مطالعہ ہر سطح پر جزوِ تعلیم ہونا چاہیے۔

۸۔ سکول سطح پر (یعنی پرائمری سے لے کر ایف اے تک) ان طلبہ کے لیے جو مستقبل میں اسلامی علوم کا تخصصی مطالعہ کرنا چاہتے ہوں اسلامی علوم کا خصوصی گروپ ہونا چاہیے (جیسا کہ اس وقت سکولوں میں سائنس، ہیومینی ٹیز، کامرس، کمپیوٹر وغیرہ کے گروپ ہیں) تا کہ معاشرے کو ٹھوس علماء/ اسلامی سکالرز مہیا ہو سکیں۔

۹۔ تعلیمی بجٹ میں بھرپور اضافہ ہونا چاہیے۔

تحقیق

۱۔ پاکستانی یونیورسٹیوں اور دینی مدارس میں تخلیقی تحقیق کو فروغ دیا جانا چاہیے۔

۲۔ تحقیق کو حقیقی زندگی اور اس کی مشکلات و مسائل سے مربوط ہونا چاہیے۔

۳۔ علوم، تعلیم، نصابات اور نصابی کتب کی اسلامی تناظر میں تدوینِ نو ہونی چاہیے۔

۴۔ امت کو درپیش سیاسی مسائل جیسے زوال سے نکلنا، مسلم نشأۃ ثانیہ، مغربی فکر و تہذیب کی تفہیم، تنقید اور ردّ کو ترجیحاً تحقیق کا موضوع بنایا جانا چاہیے۔

تربیت

۱۔ تعلیم کا اسلامی ہونا اور تربیت کا اس کا لازمی جزو ہونا شرعی تقاضا اور دنیا و آخرت میں

کامیابی کا زینہ ہے۔

۲۔ اسلامی تعلیم خصوصاً عقائد کی تعلیم بچپن میں اسی طرح دینی چاہیے کہ اس سے ان کا ایمان پختہ ہو جائے اور وہ محرکِ اعمالِ صالحہ بن جائے کہ اسی پر انسان کی دنیا و آخرت میں کامیابی کا انحصار ہے۔ بچوں کی یہ تعلیم Dogma کے انداز میں دی جائے یعنی خواہ بچوں کو سمجھ نہ آ رہی ہو۔ ان کی عقلی افادیت اور تفہیم کا کام بڑی جماعتوں میں کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ سکول سے لے کر یونیورسٹی تک تعلیمِ اخلاق وتزکیہ لازمی ہو۔ جو اسلامی تعلیم دی جائے اس پر عمل کرایا جائے مثلاً چھوٹے بچوں کو نماز یاد کرانا کافی نہیں، اس پر عمل کی پریکٹس کرائی جائے اور خضوع وخشوع سے اچھی نماز پڑھنا سکھایا جائے۔ یونیورسٹیوں میں طلبہ وطالبات سے اخلاقی اصولوں کی پابندی کرائی جائے۔

۴۔ قرآن وسنت، ماضی کے تربیتی منہج (خانقاہی نظام اور تصوف) کے تعمیری پہلوؤں سے استفادے کے ساتھ مسلم ذہن پر جدید تہذیب کے اثرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تربیتی نظام کی تشکیلِ نو ناگزیر ہے۔

۵۔ تربیت کے پیشہ ورانہ اداروں مثلاً سول سروسز اکیڈمی، کاکول اکیڈمی، جیوڈیشل اکیڈمی، پولیس اکیڈمی وغیرہ) کو تربیت کے اسلامی خطوط پر از سر نو منظم کیا جانا چاہیے اور ان کے طریق کار اور مناہج تعلیم وتربیت اور محکمانہ ترقی کو اسلامی اصولوں کے مطابق بدلا جانا چاہیے۔ آرمی ایکٹ و پولیس ایکٹ وغیرہ کو تبدیل کرنا ضروری ہے تا کہ سول سروسز، عدلیہ، فوج اور پولیس کے افراد کے غیر اسلامی تربیتی انداز کا خاتمہ ہو سکے۔

۶۔ کسی پیشہ ورانہ ادارے (بشمول فوج) کے افراد کو تربیت کے لیے امریکہ و یورپ نہ بھیجا جائے۔

۷۔ پرائمری سیکشن میں بچوں کی اسلامی تربیت پر خصوصی توجہ دی جائے کیونکہ تعمیرِ اخلاق وکردار کا مناسب ترین وقت یہی ہے۔

۸۔ تعلیم کے ساتھ ہی دنیاوی مہارتوں اور فنون کی تعلیم وتربیت بھی بہت اہم ہے تا کہ

طلبہ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی باروزگار ہو جائیں۔

دینی مدارس کی تعلیم

i۔ دینی مدارس اسلامی علوم میں تخصص کے ادارے سمجھے جائیں۔

ii۔ ان میں عمومی دینی تعلیم کے علاوہ اسلامی عمرانی علوم (اسلامی معاشیات، اسلامی سیاسیات، اسلامی قانون، اسلامی فلسفہ ونفسیات، اسلامی دعوت وابلاغ عامہ وغیرہ) کی بھی تدریس ہو۔

iii۔ موجودہ درس نظامی پر علماء کرام کی مشاورت سے نظر ثانی کی جائے۔

iv۔ مغربی فکروتہذیب کا تنقیدی مطالعہ دینی مدارس کی تعلیم کا لازمی جزو ہو۔

v۔ دینی مدارس کو پرائمری و مڈل سکول کی تعلیم دینے کا اختیار ہو جس میں ان کو عام سکولوں کے علاوہ مزید دینی تعلیم دینے کا اختیار ہو تاکہ طالب علم مستقبل میں بہترین عالم دین/اسلامی سکالر بن سکے۔

vi۔ دینی مدارس کی ڈگریاں حکومت سے منظور شدہ ہوں۔

vii۔ دینی تعلیم کا صرف ایک بورڈ (وفاق) ہو جس میں اہلِ تشیع کا سیکشن الگ ہو۔ مدارس کا نصاب ایک ہو لیکن مدارس کو نصابی کتب کے انتخاب کا حق ہو۔

viii۔ دینی مدارس کے طلبہ، دیگر طلبہ کی طرح، پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر میں ملازمت کے حق دار ہونے چاہئیں۔

ix۔ دینی مدارس کے طلبہ کو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی مہارتوں اور فنون کی تعلیم وتربیت کا بھی انتظام ہونا چاہیے تاکہ ان کو روزگار کے سلسلے میں آسانی رہے۔

دعوت وتبلیغ

ا۔ مساجد ومدارس جو کبھی دعوت وتبلیغ کے مراکز ہوا کرتے تھے، ان کے اس کردار کو بحال کیا جائے۔

۲۔ سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں بھی دعوتی سرگرمیوں کو فروغ دیا جائے۔

۳۔ حکومت اندرون و بیرونِ ملک اشاعتِ اسلام کے لیے معقول بجٹ مختص کرے۔

۴۔ مساجد کا وہ کردار بحال کیا جائے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تھا۔ اس کے لیے مناسب ہوگا کہ مساجد کو اسلامک سنٹر/ کمیونٹی سنٹر کے طور پر چلایا جائے۔ ان میں امام/ خطیب اور مقتدر نمازیوں کی مختلف کمیٹیاں بنائی جائیں جو محلے کی سطح پر خدمت خلق، غربت کے خاتمے، عدل وانصاف کی فراہمی اور امن وامان کی بحالی، دینی سرگرمیوں کی تنظیم کے لیے کام کریں۔

میڈیا

۱۔ پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کی فحاشی، عریانی اور دیگر غیر اسلامی سرگرمیوں کو روکنے کی پوری کوشش کی جائے۔

۲۔ میڈیا کو اسلامی تعلیمات کے فروغ، مغرب کی پیروی سے بچنا، خاندان کو مستحکم کرنا، اسلامی اقدار کی بحالی....وغیرہ کے لیے بھرپور طریقے سے استعمال کیا جائے۔

۳۔ الیکٹرانک میڈیا کو محدود وقت تک سرگرمیوں کی اجازت دی جائے (یعنی ٹی وی چوبیس گھنٹے کھلے نہیں رہنے چاہئیں)۔

۴۔ موبائل کے غلط استعمال کو روکا جائے۔

تزکیۂ نفس

۱۔ تزکیۂ نفس قرآن کی ایک جامع اصطلاح ہے اس سے مراد ہے نفس انسانی کی ایسی ہمہ گیر، متوازن اور جامع اصلاح جو قرآن کا مطلوب انسان تیار کرے، اس طرح کے افراد جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور نصرت سے تیار کیے تھے یعنی دنیا وآخرت دونوں میں کامیاب انسان۔ آج کل کی اصطلاحیں تعمیرِ شخصیت، کریکٹر بلڈنگ، تعمیرِ شخصیت وکردار اسی کی عکاسی کرتی ہیں۔ صحبتِ صالح و کثرت ذکر اس کا بنیادی ذریعہ ہیں۔

۲۔ تزکیۂ نفس دین کا مغز، اس کا حاصل اور اس کی غایت الغایات ہے۔ اسے دین میں مرکزی حیثیت دی جانی چاہیے۔

۳۔ ہر طرح کی تعلیم کا ہدف بھی تزکیۂ نفس ہونا چاہیے۔

۴۔ تزکیۂ نفس کے لیے ملک بھر میں ’’تربیت گاہیں‘‘ قائم کی جائیں جن میں دورِ آخر کے تصوف کی غیر اسلامی رسوم ورواج شامل نہ ہوں بلکہ تزکیہ کا معیار اور ذریعہ قرآن وسنت ہوں۔ نیز ماضی کے تجربات اور عصری ضرورتوں کے پیشِ نظر نظامِ تزکیہ کی اسلامی تناظر میں تدوینِ نو کی جائے۔

۵۔ مربی کا قرآن وسنت کا عالم ہونا اور عصری ذہن پر مغرب کے برے اثرات سے واقفیت رکھنا ضروری ہو۔

معاشی نظام

پاکستان کے معاشی نظام کو مغرب کے نظام سرمایہ داری کو ردّ کرتے ہوئے معیشت کے اسلامی اصولوں پر استوار کرنے، ملک میں غربت اور مہنگائی کے خاتمے، معاشی خود انحصاری اور معاشی استحکام کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کرنا:

۱۔ معاشی نظام کی اسلامی تشکیلِ نو کرنا: قرآن وسنت، ماضی میں امت کے تجربات، عصری ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے اور مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونزم کو ردّ کرتے ہوئے علماء کرام، اسلامی سکالرز اور اسلامی ذہن کے معاشی ماہرین مل کر اجتماعی اجتہاد سے یہ کام کر سکتے ہیں۔

۲۔ غیر ملکی سود خور اداروں (آئی ایم ایف وغیرہ) کو جن سے ماضی کی حکومتوں نے قرض لیے تھے، ان سے اگلے دس سال کے لیے قرضے ادا کرنے سے معذرت کرنا اور اس کے بعد اصل زر کی قسطوں میں واپسی۔

۳۔ ملک میں وافر مقدار میں موجود تیل، گیس، معدنیات کے ذخائر کو استعمال میں لانا۔

۴۔ سود کا خاتمہ: اندرونی وبیرونی قرضوں پر اور پرائیویٹ سیکٹر میں، ہر جگہ

۵۔ زکوٰۃ وعشر کا مؤثر نفاذ اس طرح کہ اس کے ثمرات حاصل ہوں۔

۶۔ کسبِ حرام، غرر، باطل طریقوں اور شبہ باطل سے بچنا

۷۔ ڈالر سے وابستگی ختم کرنا۔

۸۔ جاگیرداری کا خاتمہ: انگریزوں کی دی ہوئی جاگیریں ضبط کرنا۔ جاگیریں ہاریوں میں تقسیم کرنا۔

۹۔ سرمایہ داری کا خاتمہ: بڑے سرمایہ داروں کی بجائے چھوٹی صنعتوں کے لیے بلاسود قرض دینا اور کاٹیج انڈسٹری کو فروغ دینا۔

۱۰۔ تمام بینکوں کی نیشلائزیشن

۱۱۔ پرتعیش زندگی کا خاتمہ (ارکان پارلیمنٹ، سول اور ملٹری بیوروکریسی کی ہوش ربا مراعات کا خاتمہ۔ ایک کنال سے زیادہ بڑے گھر بنانے پر پابندی۔ سادگی کو فروغ دینے کے اقدامات)۔

۱۲۔ کسی تاجر فیملی کو ملک کا سربراہ نہ بنانا۔

۱۳۔ فوج کو معاشی سرگرمیوں میں مصروف نہ کرنا۔

۱۴۔ ٹیکس امیروں اور تاجروں پر لگانا نہ کہ عوام اور تنخواہ دار طبقے پر

۱۵۔ مسلمان ممالک سے تجارت کو فروغ دینا

۱۶۔ درآمدات پر پابندی خصوصاً سامان تعیش اور کاروں وغیرہ پر۔

۱۷۔ ہیوی انڈسٹری اور ٹیکنالوجی میں خود انحصاری

۱۸۔ چھوٹے شہروں میں اور ضلعی سطح پر فیکٹریاں اور کارخانے لگانا، اچھے ہسپتال اور یونیورسٹیاں بنانا تاکہ لوگ دیہات اور قصبات سے بڑے شہروں میں منتقل ہونے کی کوشش نہ کریں۔

۱۹۔ بلوچستان اور سندھ میں پٹرول اور گیس کے وسیع ذخائر موجود ہیں جنہیں عالمی

طاقتوں کے دباؤ کی وجہ سے نکالانہیں جاتا۔حمیت اور جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں تیل اورگیس کے ان ذخائر کو نکالنا اور استعمال میں لانا چاہیے۔

۲۰۔ کرپشن پر بھاری مالی جرمانے کے علاوہ کوڑوں کی سزا دینا،عمر قید اور خصوصی حالات میں تعزیراً موت کی سزا دینا۔

اگر مندرجہ بالا تجاویز پر عمل کیا جائے تو اگلے پانچ سال میں پاکستان سے غربت بیروز گاری اور مہنگائی ختم ہوجائے گی۔ روٹی، کپڑا، مکان اور علاج سب کو میسر آ جائے گا اور دس سال بعد پاکستان ایک امیر ملک ہوگا، ان شاءاللہ۔

عدالتی نظام

۱۔ قانون کی تعلیم کے موجودہ ڈھب کو ختم کر دیا جائے گا اور قانون کی موجودہ تعلیم کے ساتھ قرآن وسنت، عربی زبان اور فقہ واصول فقہ کی تعلیم کو قانون کے طلبہ کے لیے لازمی کر دیا جائے گا، گویا موجودہ لاء کالجز کو کالج آف شریعہ اینڈ لاء اور ایل ایل بی کو ایل ایل بی شریعہ بنا دیا جائے گا۔اسلامی مضامین پڑھانے کے لیے موزوں اساتذہ مہیا کیے جائیں گے۔

۲۔ جب تک نئے نظام ونصاب کے تیار کردہ افراد میسر نہیں آتے، اُس وقت تک موجودہ وکلاء اور ججز (نیچے سے لے کر اوپر تک سب) کو قرآن وسنت، عربی زبان، فقہ واصول فقہ کی تعلیم وتربیت دی جائے گی۔ ہر سطح کی عدالت پر ہر جج کے ساتھ ایک مفتی بٹھایا جائے گا جس سے مشورہ کرنا جج پر لازم ہوگا۔

۳۔ وکلاء کے موجودہ کردار پر نظر ثانی کی جائے گی۔ اور برطانوی عدالتی نظام کے طریق کار سے جان چھڑانے کی کوشش کی جائے گی۔

۴۔ پاکستان کی ہر عدالت فیصلے قرآن وسنت کے مطابق کرنے کی پابندی ہوگی اور ہر عدالت کے ہر فیصلے کو ہر پاکستانی اس بناء پر 'آئینی عدالت' میں چیلنج کر سکے گا کہ وہ خلافِ اسلام ہے۔

۵۔ مرکز میں ایک 'آئینی عدالت' بنائی جائے گی جس کے سارے ارکان ایسے عالم اور

فقیہ ہوں گے جو جدید قوانین سے بھی واقف ہوں گے تاہم جب تک ایسے افراد میسر نہیں آتے، اس وقت تک اس آئینی عدالت کا سربراہ ایک عالمِ دین جج ہوگا۔ اس عدالت میں عالمِ دین ججز تین چوتھائی ہوں گے اور وکلاء ججز ایک چوتھائی ہوں گے۔

۶۔ مغرب کے سزائے موت کو ختم کرنے کے مطالبے کو رد کر دیا جائے گا۔

۷۔ حدود قوانین جو آئین کا حصہ ہیں، ان پر عمل کیا جائے گا۔

۸۔ تمام غیر اسلامی قوانین جیسے سود، خواتین سے متعلق قوانین، ٹرانس جینڈر رزا یکٹ، اوقاف سے متعلق قوانین وغیرہ کو ختم کر دیا جائے گا۔

معاشرت

۱۔ خواتین کے تعلیمی اداروں میں 'حسنِ معاشرت/ فیملی سٹڈیز' کا مضمون لازمی ہوگا۔

۲۔ میڈیا کو خاندانی نظام کو کمزور کرنے کے پروگرام نشر کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

۳۔ عورتوں کی ایسی آزادی جس کی اسلام کے معاشرتی نظام میں گنجائش نہیں، ممنوع ہوگی۔

۴۔ لڑکیوں کے گھروں سے بھاگنے کے اسباب کا قلع قمع کرنا ہوگا۔ عدالتوں کو اس طرح کے نکاح کو Discourage کرنا ہوگا۔ سِول کورٹ کا نکاح ختم کر دیا جائے گا۔

۵۔ مغربی فکر و تہذیب کا عورت اور مرد کا مساوات کا تصور اور عورتوں کی Empowerment کے منصوبوں کو رد کر دیا جائے گا۔

۶۔ میڈیا (پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل) تھیٹر، فلم، ادب وغیرہ سے فحاشی و عریانی اور رقص و سرود کو مہمیز دینے کے پروگرام ختم کر دیے جائیں گے۔

۷۔ عفت، حیاء اور پردے کی اقدار کو فروغ دیا جائے گا۔

۸۔ NGOs کو ملنے والی غیر ملکی فنڈنگ کو بند کر دیا جائے گا تاکہ ان کی ملک دشمن اور اسلام دشمن سرگرمیوں کا تدارک کیا جاسکے۔

تعلیم و تربیت پروفیسر عبداللہ

یونیورسٹیوں میں زوالِ تحقیق

پاکستان میں سوشل سائنسز اور ہیومینیٹیز کے شعبوں میں آج کل تحقیق کی جو فراوانی اور ارزانی ہو رہی ہے وہ جامعات سے وابستہ لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے۔ ریسرچ کے نام پر رطب و یابس کو جس طرح اصلی، نیم جعلی اور جعلی تحقیقاتی مجلوں میں شائع کیا جا رہا ہے، یہ پاکستان میں تحقیق کے کلچر کو تباہی کے دہانے پر پہنچا چکا ہے۔ یہ اسی طرح چلتا رہا تو ہماری اگلی نسلیں تحقیق کے بنیادی تصورات سے بھی آگاہ نہیں ہوں گی۔

ہائیر ایجوکیشن کمشن کے اربابِ اختیار سے گزارش ہے کہ اس خرابی کا جائزہ لے کر اس کا تدارک کریں۔ سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ ایسے مجلّات جو لوگوں نے اپنی ذاتی حیثیت میں چلائے ہوئے ہیں اور ایچ ای سی سے کیٹیگری یافتہ ہیں ان کے کام پر گہری نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد سرکاری اور پرائیویٹ جامعات سے نکلنے والے تحقیقی مجلوں کے معیار کو بھی جانچنے کی ضرورت ہے۔ ایک اہم کام اس سلسلے میں یہ ہے کہ مجلّے کی ادارت کا حق صرف ایسے سکالر کو ہونا چاہیے جس کی تحقیق بین الاقوامی معیار کے مجلّات میں شائع ہو چکی ہو۔

آخری بات یہ ہے کہ ہمیں اللہ سے ڈرنے کی ضرورت ہے۔ اگر آخرت کا خوف نہ ہو تو اصول و قواعد کو بائی پاس کرنے کا کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے۔ آمین

تعلیم و تربیت

طارق سلیم لون ⁽¹⁾

نئی نسل کے رجحانات اور ہمارا نصابِ تعلیم
قرآن حکیم سے غفلت

تعلیم القرآن کی اہمیت

قرآن مجید میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا﴾ [الفرقان ۲۵:۳۰] ''رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) روزِ قیامت یوں کہیں گے، اے میرے پروردگار میری قوم نے اس قرآن حکیم کو چھوڑ دیا تھا۔''

قرآن کو چھوڑ دینا یہ ہے کہ اسے ہاتھ ہی نہ لگایا جائے یعنی اس کی تلاوت نہ کی جائے یا تلاوت کی جائے مگر اس کے مطالب/حکمت پر غور نہ کیا جائے۔ اور چھوڑنے کی تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پڑھنے اور سمجھنے کے بعد اس کے احکامات کو نظر انداز کر دیا جائے اور انہیں پس پشت ڈال دیا جائے۔ درحقیقت قرآن حکیم ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ اسے پڑھا جائے، اس میں تدبر کیا جائے اور پھر اس کے احکامات پر خود بھی عمل کیا جائے اور دوسروں کو بھی اس پر عمل کی دعوت و ترغیب دی جائے بلکہ نافذ کیا جائے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَي النُّوْرِ﴾ [ابراہیم ۱۴:۱] ''یہ ایک (پُرنور) کتاب ہے اس کو ہم نے تم پر اس لیے نازل کیا ہے کہ لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لے جائے۔''

گویا قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ اس پر عمل انسان کو جہالت اور گمراہی سے نکال کر حقائق کے روشن اُجالوں کی طرف لے جاتا ہے۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

⁽¹⁾ آئی جی پولیس (ر) اسلام آباد

یعنی مسلمانوں کے زوال کا سبب قرآن کو چھوڑ دینا ہے اور اس کی تلاوت، اس کا فہم اور اس پر عمل ہی انہیں دنیا و آخرت میں عزت، وقار اور کامیابی دلا سکتا ہے۔

ہماری موجودہ صورتِ حال

* ہم فانی و ناقص العقل انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو پڑھنے، سمجھنے اور ان سے استفادہ کرنے کے لیے تو وہ زبانیں بڑی محنت سے سیکھتے ہیں جن میں وہ لکھی ہوئی ہیں اور کئی کئی سال اس میں صَرف کر دیتے ہیں مگر کلام اللہ جو حکمت و ہدایت کا سرچشمہ ہے، اس کو سمجھنے اور اس سے استفادہ کرنے کے لیے قرآن کی زبان سیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

* ہمارے ہاں تقریباً تمام پڑھے لکھوں کا یہ حال ہے کہ اگر ان کے سامنے قرآن حکیم کی چند آیات پڑھی جائیں یا وہ خود پڑھیں تو وہ انہیں سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں تاوقتیکہ ان کا ترجمہ یا مفہوم انہیں نہ سنایا جائے یا وہ خود نہ پڑھ لیں۔ کہنے کو تو ہم قرآن حکیم کو اللہ کی حقیقی اور آخری کتاب مانتے ہیں، جس کے مقابلے میں دنیا بھر کی کتب، ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے ہیچ ہیں۔ الہامی کتاب ہونے کے حوالے سے ہم اسے ہدایت اور دین کا سرچشمہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے مگر عملی طور پر صورتِ حال یہ ہے کہ قرآن کو ناظرہ تو شاید ایک خاصی تعداد میں پڑھ لیں لیکن یہ اہلیت یکسر مفقود ہے کہ ناظرہ پڑھتے ہوئے یا قرآنی آیات سنتے ہوئے ہم ان کا سیدھا سادہ مطلب بھی سمجھ سکیں۔ ہر نمازِ جمعہ کا عربی خطبہ سنتے ہوئے گھر یا مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے یا قرآنی دعاؤں پر آمین کہتے ہوئے ہماری کم و بیش یہی کیفیت ہوتی ہے۔

* ایک پردہ ہے جو ہمارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حائل ہے جس کے باعث ربّ العالمین سے ہمارا براہ راست رابطہ ٹوٹا ہوا ہے۔ رشد و ہدایت کا نور جو ہماری روحوں کے ریگزاروں کو پل بھر میں سرسبز و شاداب کر دینے کا کرشمہ لیے ہوئے ہے وہی کرشمہ جس نے رسولِ خدا کے سب سے بڑے دشمن کو چند لمحوں میں پُرنور کر کے دنیائے اسلام کے سب سے بڑے محافظ میں بدل دیا تھا، اس سے محروم رکھے ہوئے ہے (اشارہ ہے حضرت عمرؓ کے دین اسلام قبول کرنے کی طرف) اور اپنے بندے کو اپنے آقا کی بتائی ہوئی دعاؤں کے شرفِ قبولیت کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔

آخر ایسا کیوں ہے؟ اس صورت حال کی بنیادی وجہ قرآن حکیم کے بارے میں مِن حیث القوم

ہمارا رویہ ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم زیادہ سے زیادہ یہ کرتے ہیں کہ اپنے بچوں کو قرآن کی ناظرہ تعلیم دلوائیں اور بعض حضرات چار قدم اور آگے بڑھیں گے اور بچوں کو قرآن حفظ کروا دیں گے۔ پھر کسی قاری صاحب کی وساطت سے قرآن کے رموزِ اوقاف سکھا دیں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر قرآن پاک کی تلاوت کی جائے تو ثواب ملتا ہے۔ اسی پر ہم اکتفا کر لیتے ہیں۔ قرآنِ حکیم کی حکمت وفراست کے بھرپور خزانوں سے ہم بس چند سکے لے کر سمجھتے ہیں کہ سرخرو ہو گئے ہیں۔ ہم کتنے گھاٹے میں ہیں کہ ان خزانوں سے فیض یاب ہونے کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔

* ہمارا نصابِ تعلیم اسی سوچ کی عکاسی کرتا ہے جہاں اسلامیات کے نام پر اسلام کا نامکمل پیغام بچوں تک پہنچایا جاتا ہے اور پھر سمجھ لیا جاتا ہے کہ ہماری نسلیں اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر خود بخود چل نکلیں گی۔ بچوں میں یہ اہلیت پیدا کرنے کا خیال ہی ہمارے دلوں میں نہیں آتا کہ جب وہ اللہ کا کلام پڑھیں یا سنیں تو وہ ان کے دلوں میں اُتر کر ان کی سوچ اور عمل کی راہوں کو روشن کرتا چلا جائے۔

* آج بھی وقت ہے ہم اپنی سوچ اور ترجیحات کو درست کر کے اپنی آنے والی نسلوں کو نورِ ہدایت کے بے پناہ خزانوں سے محروم ہونے سے بچا سکتے ہیں اور یہ کوئی بہت مشکل کام بھی نہیں ہے بس نیت اور سمت درست کرنے کی بات ہے۔ ہمارے سامنے انگریزی زبان کی مثال موجود ہے آج سے کئی سال پہلے چھٹی جماعت سے شروع کر کے گیارہویں میں پہنچ کر طالب علم سائنس وغیرہ کے تمام مضامین انگریزی میں پڑھا کرتا تھا، نہ صرف پڑھتا بلکہ انگریزی میں پرچے حل بھی کرتا تھا اور کسی حد تک بولنے کی استعداد بھی پیدا کر لیتا تھا۔ ایک غیر مانوس زبان جس کا رسم الخط بھی بالکل مختلف ہے ہمارے بچوں کے سیکھنے کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔

قرآن کی زبان تو ہماری اپنی زبان سے بہت قریب ہے۔ رسم الخط بھی ملتا جلتا ہے۔ بے شمار الفاظ عربی زبان سے ماخوذ ہیں۔ بعض علماء کی رائے میں عام سطح پر قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے پندرہ سولہ سو الفاظ سیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ قرآن حکیم کو سامنے رکھ کر صَرف ونحو کے قواعد ترتیب دیئے جا چکے ہیں تاکہ انہیں سیکھ کر قرآن مجید کو سمجھنا بالکل آسان ہو جائے۔ سکولوں میں پڑھانے والوں کی خاصی تعداد بھی موجود ہے۔ ان تمام آسانیوں کے

باوجود ہمارا نظامِ تعلیم ہماری نسلوں کی صحیح سمت میں رہنمائی کرنے سے قاصر ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم درست سمت اختیار کرلیں۔ اس ضمن میں درج ذیل تجاویز پیش خدمت ہیں جنہیں اپنا کر ہم ان شاء اللہ صحیح منزل کی طرف گامزن ہو سکتے ہیں۔

تجاویز

* اسلامیات کا لازمی مضمون اُردو اور انگریزی میڈیم سکولوں میں پہلی جماعت سے ہی شروع کردیا جائے۔ قرآن فہمی کا تعلیمی نصاب اسی جماعت سے شروع کیا جاسکتا ہے اور یہ اسلامیات کا لازمی حصہ قرار دیا جائے۔ پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک دس سال کا عرصہ ایک سوچ سمجھے منصوبے کے تحت (ماہرین تعلیم اور علماء کرام کی مدد سے مرتب کیا جائے) اس ہدف کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے کہ وہ قرآن حکیم کو ناظرہ پڑھتے ہوئے یا آیاتِ قرآنی کو سنتے ہوئے ان کا سیدھا سادہ مفہوم بغیر ترجمے کی مدد سے سمجھ سکیں تاکہ آئندہ زندگی میں ہدایت اور روشنی کے اس دائمی سرچشمے سے راہ راست فیض یاب ہوکر فکر وعمل کی راہوں میں اُجالا پاسکیں اور اپنے ربّ کی بے حساب نعمتوں کے مستحق ٹھہر سکیں۔

* پاکستان ٹیلی ویژن کے تعلیمی چینل اور ریڈیو پاکستان کے ذریعے بالغوں کی تعلیم قرآن کے لیے خصوصی پروگرام شروع کیے جائیں۔ (خواندہ اور غیر خواندہ حضرات کے لیے الگ الگ پروگرام مرتب کیے جائیں)۔ ان پروگراموں کا مقصد بھی یہی ہونا چاہیے کہ مناسب عرصے میں بالغ مردوں اور عورتوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ قرآنی آیات کو پڑھتے یا سنتے ہوئے براہ راست سمجھ سکیں۔

* دینی مدارس اور مساجد میں اسی ہدف کو سامنے رکھ کر مناسب انتظام کیا جائے تاکہ زیادہ لوگ استفادہ کرسکیں۔

* تمام پیش اماموں اور خطیبوں کے لیے لازمی قرار دیا جائے کہ وہ اذان، جمعہ کے عربی خطبے، نماز اور دعاء میں بکثرت پڑھی جانے والی آیات کریمہ اور نماز کے بعد پڑھی جانے والی قرآنی ومسنون دعاؤں کا ترجمہ اور مفہوم باقاعدگی کے ساتھ حاضرین کو بتایا کریں تاکہ لوگ استفادہ کرسکیں اور ان کی سوچ اور اعمال صراط مستقیم کی جانب گامزان ہوسکیں۔

* اس ضمن میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد بھی اہم رول ادا کرسکتی ہے۔

تعلیم و تربیت ادارہ

استعمار اور مسلم اصطلاحات

انگریزوں نے ہماری اصطلاحات کو بھی پرالٹ دیا اور ہمیں اس کی خبر ہی نہیں

* صوبے دار کا عہدہ گورنر کا عہدہ ہوتا تھا، انگریز نے ایک لفٹینینٹ کے ماتحت عہدے کو صوبیدار کا نام دے دیا۔

* سلطان ٹیپو کے وزیرِ خوراک کے منصب کو ''خانِ سامان'' کہا جاتا تھا، انگریزوں نے اپنے باورچی کو خانساماں کہنا شروع کر دیا۔

* ٹیپو سلطان نے سلطنت عثمانیہ کے خلیفہ سے مدد چاہی تھی، انگریزوں نے حجام کا نام خلیفہ رکھ دیا۔

* ٹیپو کے دربار میں پگڑی کو عزت اور فضیلت کی علامت سمجھا جاتا تھا، انگریز نے نوکروں اور غلاموں کو پگڑی پہنا دی۔

* ٹیپو سلطان کے دور میں ''جمعدار'' ایک بڑے پولیس افسر کا عہدہ تھا، انگریزوں نے خاکروب کو جمعدار کا نام دے دیا۔

* بادشاہ یا سلطان کے دو بڑے معتمد اور وزیر، بادشاہ کے دائیں اور بائیں بیٹھتے تھے تو ان کی قربت اور سمت کی وجہ سے انہیں فارسی میں چپ (بائیں) اور راس (دائیں) کی نسبت سے ''چَپ راسی'' کہتے تھے۔ اتنے معزز عہدوں کے نام کو ذلیل کرنے کے لیے انگریزوں نے Peon کو چپراسی کا نام دے دیا۔

ہماری فرمانبرداری دیکھیے کہ ہم آج تک نفرت اور تذلیل کی اس میراث کو گلے سے لگائے پھر رہے ہیں بلکہ ہمیں اس کی خبر ہی نہیں۔

تزکیۂ نفس

احمد جاوید
جمع وتدوین: عثمان فاروق

دین کیا ہے اور دینداری کسے کہتے ہیں؟

یہ بہت ضروری سوال ہے اور یہ ایسا سوال ہے جس میں اگر Clarity نہ ہو تو دین اور دینداری دونوں کا نقصان ہو جاتا ہے یا دینداری کے نام پر کچھ غیر ضروری رویے اور احکام پیدا ہو جاتے ہیں۔ مَیں اس طرح جواب دینے کی کوشش کروں گا کہ یہ نوجوانوں کے لیے بھی قابلِ فہم ہو۔

دین نام ہے اللہ کے ساتھ تعلق میں سچا ہو جانے کا یعنی سارا دین اس غرض سے اترا ہے کہ ہم بندے کی پوزیشن لے کر اللہ تعالیٰ سے تعلق میں سچائی کے راستے پر حفاظت سے اور یقین سے اعتماد کے ساتھ چلتے رہیں۔ اس کے لیے ہمیں کچھ نہیں کہا گیا کہ آپ اس راستے کا کوئی Survey کروائیے یا اس میں اپنی طرف سے کوئی زادِ سفر لے کر آئیے۔ اس میں بڑی رحمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود یہ بتا دیا ہے کہ خیال، حال اور عمل کے طور پر میرا تعلق کیا ہوتا ہے؟ تم بس بندگی کی پوزیشن لے لو۔ اور وہ بھی ہم نے تمہیں بتا دی ہے کہ ہم پر ایمان لاؤ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لاؤ اور اس ایمان کے اخلاقی نتائج بھی پیدا کر کے دکھاؤ اور اس ایمان کا جو سب سے فطری اظہار ہے، یعنی عمل صالح، وہ بھی کر کے دکھاؤ۔ اگر یہ نیکی عمل سے ظاہر نہیں ہوتی تو ایمان میں آپ کی سچائی Question ہو جائے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور اللہ کے حکم پر رسول اللہ کی مطلق اور مکمل رہنمائی میں چلنا ہے تو اس کے لیے اتنی Binding عقیدے کے ساتھ ہماری ضرورت ہے کہ اللہ سے تعلق کی جو فطری جہتیں ہیں انہیں ہم اہمیت دیں کیونکہ ان کو حاصل کیے بغیر اللہ تعالیٰ سے تعلق کا جوہر میسّر نہیں آئے گا۔ اس لیے کہ ہم نے اللہ سے ڈرتے ہوئے اللہ کو مانا اور اس ماننے کے نتیجے میں ہمارے اندر دو حالتیں خشیت اور محبت پیدا ہوئیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ ہے دوسری یہ کہ ہم کچھ بھی نہیں۔ اس احساس کے نتیجے میں جو تعلق بندے اور پروردگار میں پیدا ہوگا وہ اس طرح کا نہیں ہوتا کہ کچھ مَیں کہوں اور کچھ وہ کہے بلکہ یہاں تو بندے کی حیثیت سے بالکل Passive End پر تسلیم و رضا کے جذبے کے ساتھ ثابت قدم

رہنا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے تو اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے برابر کوئی محبوب نہیں ہے، اللہ کے برابر کوئی مطلوب نہیں ہے یعنی محبوبِ حقیقی اور مطلوبِ حقیقی صرف اللہ ہی ہے۔ یہ ایمان کا لازمی معنی ہے اور یہ کوئی رومانوی بات نہیں ہے۔

لفظ الٰہ کے معانی میں ایک مفہوم عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے وہ ہے محبت کا۔ الٰہ وہ ہے جس پر اپنی تمام صلاحیتِ محبت کو نچھاور رکھا جائے یعنی میرے اندر محبت کی جتنی بھی ذہنی، قلبی اور عملی استعداد ہے وہ ساری کی ساری مَیں اللہ پر بلا تعطل صَرف کرتا رہوں کہ وہی اس کا حقدار ہے۔

الٰہ وہ ہے جس کی محبت میں تعطل نہیں ہوتا، جس کی محبوبیت میں کوئی شریک نہیں ہے تو یہ الٰہ کے لفظی مفاہیم میں سے ایک ہے۔ میرے ایمان کی Objective اور خارجی شہادت میرا عملِ صالح ہے جس کا مطلب ہے اتباعِ سنت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اعمال۔ وہ نیک اعمال، دین کے نام پر بظاہر نیک اعمال، عملِ صالح نہیں کہلائیں گے جن کو رسول اللہ کی سنت کی تائید حاصل نہ ہو ہے۔ سنت کے مطابق عمل صالح سے میرے ظاہر کی تصدیق ہوگئی کہ میں اللہ کو سنجیدگی اور بندگی کے ساتھ مانتا ہوں لیکن میرے باطن کو تصدیق کی حاجت ہے یعنی خود مجھے یہ خواہش ہے کہ میں اپنے ایمان کی سچائی پر شکر گزاری اور یقین کے ساتھ گواہ بنوں۔

محبت اور خشیت کے بغیر ایمان ناقص ہے۔ میں نے اللہ کو مانا، اس کے نتیجے میں میرے دل کے مرکز میں اس کی محبت پیدا ہوئی اور اس محبت کی سچائی کے نتیجے میں وہ خشیت بھی داخل ہوگئی جن کو اب تک مَیں الگ الگ سمجھتا تھا۔ اللہ سے تعلق کا مجھ پر یہ فیض مرتب ہوا کہ خشیت کو محبت کہنا درست ہو گیا اور محبت کو خشیت قرار دینا صحیح ہو گیا۔ تو یہ جیسے ترکیبی سا حال ہے کہ جب مَیں اللہ کی طرف یکسو ہوں تو اس وقت مجھے اللہ کی محبت اس کی طرف یکسو رکھتی ہے اور مَیں گناہوں سے بچتا ہوں، غفلت سے بھاگنا چاہتا ہوں تو میرے اس عزمِ توبہ پر میری اس فرمانبرداری پر یہ تصور غالب رہتا ہے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے، تو اللہ کی نظر میں ہونے کا احساس خشیت پیدا کرتا ہے اور محبت اللہ کی طرف متوجہ ہونے کی قوت ہے۔ اگر یہ محبت نصیب نہیں ہوئی تو آپ کو اللہ کی طرف یکسوئی میسر آ ہی نہیں سکتی۔ اور اگر خشیت حاصل نہیں ہے تو آپ اس بات کو گویا نہیں مانتے کہ مجھے اللہ دیکھ رہا ہے۔

دینداری نام ہے ایمان کے باطنی حقوق کو پورا کرنے کا یعنی تعلق باللہ کے لیے جذباتی

اور احساساتی شہادتوں کی فراہمی کا۔ اگر میرے یہ احوال تصدیق کردیں کہ مَیں نے اللہ کو مانا ہے تو میرا ایمان کامل ہے اور اگر میرے احوال اللہ کو ماننے کے فیصلے سے لاتعلق رہیں تو مَیں نے پھر گویا اللہ کو سنجیدگی سے یا مطلوبہ معیار پر نہیں مانا اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی آسانی پیدا کردی گئی ہے کیونکہ لوگ یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ اللہ تو ہم سے بالکل ہی غیب میں ہے ہم اللہ کو کسی بھی صورت سے دیکھ نہیں سکتے اس کی ذات کی Presence کو محسوس نہیں کرسکتے تو اس لازمی مجبوری کے ماحول میں ہم اس سے محبت کیسے کرسکتے ہیں؟ محبت میں تو دیکھنا ضروری ہوتا ہے Interaction ضروری ہوتا ہے۔

اس کا سادہ ترین حل یہ ہے جو اللہ کی طرف سے ہم سب کو میسر ہے وہ یہ کہ ہمیں اپنے ہر محبوب سے زیادہ محبت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہونی چاہیے۔ اگر ہم نے یہ شرط پوری کردی کہ دیکھ لو میری اولاد کی محبت ایک درجے پر ہے (اگرچہ یہ محبت بھی نعمت ہے) لیکن رسول اللہ کی محبت اسی Scanner پر (جو جذباتی اور احساساتی Scanner ہے) ایک اور لامحدود تناسب پر ہے (اولاد اور رسول اللہ کی محبت کے درمیان)۔

دینداری کی بالکل آسان ترین پہچان یہ ہے کہ جس نے حُبّ رسول کے تقاضوں کو پورا کردیا وہ اللہ سے تعلق کے باطنی آداب کو نبھانے میں یقیناً کامیاب ہوگیا۔ یہ شرط ہم سب کو اپنے اندر پوری کرکے دیکھنا چاہیے کیونکہ ہمارے اندر اللہ کی جو خشیّت اور محبت ہے اس میں کوئی بھی درجہ ایسا نہیں ہے کہ جہاں رسول اللہ کو محبوب بنائے بغیر اللہ تعالیٰ سے محبت کی جا سکے۔ اللہ کی خشیت میں تو اس طرح کی Presence نہیں ہے کیونکہ اللہ کی خشیت یہ ہے کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے اب بیچ میں کچھ نہیں اور نہ یہاں ضرورت ہے لیکن جب مَیں اللہ کی طرف عروج کروں گا یعنی بندگی میں کمال پیدا ہوگا اور تعلق کی تکمیل کے آداب پورے کرنے لگوں گا تو وہاں اس سفرِ محبت میں کوئی مرحلہ ایسا نہیں ہے خواہ میں عرش پر بھی پہنچ جاؤں یا لامکاں کو بھی سر کرلوں لیکن کبھی ایسا نہیں ہوگا کہ محبوبِ اوّل و محبوبِ حقیقی والی یہ Hierarchy ٹوٹے۔ ہر مرحلۂ وصول (وصول صوفیوں کی اصطلاح میں) اللہ سے یقینی قُرب کے آخری درجے پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واحد وسیلہ کے طور پر میرے اور اللہ کے بیچ میں تشریف رکھتے ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو وہ اللہ (نعوذ باللہ) میرے خیال کا خلق کردہ ہے الٰہِ محمد (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نہیں ہے۔

تزکیۂ نفس

مدیر

کِینہ ـ ایک مہلک اخلاقی مرض

جس میں عوام کے ساتھ ہمارے حکمران بھی مبتلا ہیں

کِینہ اور بُغض ملتے جلتے اخلاقی امراض ہیں۔بغض کہتے ہیں دوسرے کی بدخواہی کو اور کِینہ کہتے ہیں اس بدخواہی پر عمل کرنے کی شدید خواہش کو۔کِینہ اس کیفیت کا نام ہے جس میں آدمی کو کسی سے کوئی شکایت پیدا ہو تو بھلے لوگوں کی طرح اس شکایت کا ازالہ کرنے کی بجائے وہ آدمی اسے دل میں پالتا رہتا ہے۔یہاں تک کہ وہ شکایت بغض میں بدل جاتی ہے اور بغض بڑھتے بڑھتے عداوت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔کِینہ عداوت کی اسی صورت کو کہتے ہیں۔

بغض و کینہ ایک مہلک اخلاقی مرض ہے۔قرآن حکیم نے اسے شیطانی فعل قرار دیا ہے (المائدہ ۵:۹۱) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ دین کا صفایا کر دینے والا مرض ہے جس طرح کہ بال مونڈے جاتے ہیں [۱] اور یہ سارے اخلاق حسنہ کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔[۲] اس مرض میں مبتلا شخص اذیت پسند ہو جاتا ہے اور سچی خوشی سے محروم رہتا ہے۔اس میں مبتلا شخص منفی سوچ کا حامل اور تخریبی طبیعت کا حامل ہو جاتا ہے اور اس جذبے کی کثرت سے شخصیت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔

بدقسمتی سے بغض و کینہ کا مرض ہمارے معاشرے میں عام ہے لیکن اس کے دینی اور دنیاوی نقصانات پر غور کرنے والے لوگ اور اپنی اصلاح کی خواہش رکھنے والے افراد بہت کم ہیں۔ہم نے بعض لوگوں کو شکایت کرتے سنا ہے کہ ہمارے ملک کے قاضی القضاۃ کا رویہ بعض لوگوں کے بارے میں سخت کینہ پر مبنی ہے اور یہ ان کے عدالتی فیصلوں سے ظاہر و باہر ہے کوئی پوشیدہ امر نہیں۔اسی طرح ہمارے بعض حکمران سیاستدان اور بعض فوجی مقتدر افراد بعض مخالفین کے خلاف اس طرح کا کینہ رکھتے ہیں کہ اگر ان کے بس میں ہو تو اپنے بعض

[۱] جامع ترمذی، ابوب صفة القيامة، باب ما جاء فی ظن السوء

[۲] مسند احمد بن حنبل، ج ۱، ص ۱۶۵، ۱۶۷

مخالف افراد کو کچل کر رکھ دیں اور انہیں نسیاً منسیاً کر دیں، مٹا کر رکھ دیں۔ ان کے بغض و کینہ نے اُسے ذاتی دشمنی میں تبدیل کر دیا ہے۔

بہتر طرزِ عمل یہ ہے کہ خوش گمانی سے کام لیا جائے اور دوسروں کو معاف کر دیا جائے۔ حسد کرنے اور بغض و کینہ میں مبتلا شخص دوسروں کا نقصان تو کرتا ہی ہے، وہ خود بھی بغض و حسد و کینہ کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ اس کی شخصیت غیر متوازن ہو جاتی ہے، وہ اپنے مخالف کے خلاف ہر وقت سازشیں کرتا رہتا ہے اور اسے نقصان پہنچانے کے منصوبے بناتا رہتا ہے۔ یہ چیز اس کی شخصیت کو مجروح کرتی ہے اور وہ سچی خوشی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اور سب مسلمانوں کو بغض و کینہ سے بچنے کی توفیق عطا فرمائیں، خصوصاً رمضان المبارک میں ہم میں سے ہر ایک کو اپنی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔

بقیہ: ہم نے رمضان سے کیا حاصل کیا؟

لیکن ایسا ہو نہیں رہا ہمارے معاشرے میں غُربت ایک لعنت بن کر رہ گئی ہے رمضان میں مہنگائی نے غریب کے منہ سے نوالہ بھی چھین لیا ہے، وہ پھل کیا کھائے گا۔ غریب گوشت کیا کھائے گا؟ جو سبزی ۸۰ روپے کی تھی وہ ۱۸۰ روپے پر پہنچ گئی۔ پیاز ٹماٹر کے نرخ آسمانوں پر ہیں۔

اس ماہ میں ہمارا زیادہ فوکس سحر و افطار پر ہوتا ہے۔ یہ صرف گناہوں کی بخشش کا مہینہ نہیں بلکہ صبر اور غمخواری کا مہینہ بھی تھا۔ ہمارے اندر کتنا صبر اور غمخواری پیدا ہو سکی ہے؟ ہم نے ضرور سوچنا ہے۔ غزہ کے بے یار و مددگار لوگوں کے دکھ درد نہیں بھولنے۔

اے اللہ ہمارے دل نرم فرما! ہمارے فلسطین اور کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی غیبی نصرت فرما! ان بے گھروں کو پھر سے ان کے گھروں میں آباد فرما! آمین یا رب العالمین۔

تزکیۂ نفس

حافظ محمد عمران طحاوی

ہم نے رمضان سے کیا حاصل کیا؟

رمضان المبارک اپنے ساتھ اتنی برکتیں فضیلتیں اور رحمتیں لے کر آیا تھا جن کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔ اس مہینہ میں فرض کا ثواب ۷۰ گنا اور نفل کا ثواب فرض کے برابر کر دیا جاتا ہے۔

وقت اتنی سرعت کے ساتھ گزرا کہ کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ کل شروع ہوا اور اب اختتام کو پہنچ رہا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا وہ شخص محروم ہی ہے جو اس ماہ مبارک میں بھی محروم رہا یعنی بخشش کے لائق کچھ کر نہ سکا۔

روزے کو عربی میں صوم کہتے ہیں جس کا لغوی معنی ہے رکنا۔ رک کر سوچنا، رک کر اپنے اعمال پر نظر ثانی کرنا اور درست رویہ اختیار کرنا۔ مگر معاف کیجئے گا ہم رکنا ہی تو نہیں چاہتے۔ ہم روزہ کے دوران کھانے پینے سے تو رُک جاتے ہیں مگر جھوٹ بولنے، کسی کو تکلیف دینے، بدنگاہی اور منکرات سے نہیں رکتے۔

سوچیں! فکری گہرائی کے ساتھ سوچیں کہ کیا ہم نے اس رمضان المبارک میں کوئی ایسا کام یا عبادت کی ہے جو صدقہ جاریہ بن سکتی ہو؟ روزہ ایمان اور احتساب کا تقاضا کرتا ہے۔

ماہ رمضان طرح طرح کی نعمتیں کھانے کا مہینہ تھوڑی تھا بلکہ ایک خاص وقت تک بھوکے پیاسے رہ کر بھوکے پیاسوں کا احساس بیدار کرنے کا نام تھا۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

ہم صرف اپنے گھروں کے دسترخوان ہی سجاتے رہے ہیں یا کسی بھوکے کے گھر میں بھی کھانا مہیا کیا؟ کیا کسی غریب کے بچوں کے لیے بھی کپڑے خریدے یا صرف اپنے ہی بچوں کو

خوش کرتے رہے، چار چار جوڑے دلا کر؟ کیا یہ ہمارے لیے لمحہ فکریہ نہیں؟

کیا آپ نے کبھی اپنے پڑوس کے کسی غریب گھر میں جھانک کر دیکھا کہ آج اس کے گھر افطار کے لیے کچھ ہے بھی کہ نہیں؟ اگر نہیں تو سوچیے! کہ یہ روزے، یہ نماز، یہ ربّ کو راضی کرنے کے لیے شبِ قدر کی راتوں میں جاگنا، یہ تراویح اور تلاوت۔ انہوں نے ہمارے دل نرم کیوں نہیں کیے؟

ایسی عبادات جن میں صرف اپنی غرض پوشیدہ ہو، اپنے گناہوں کی بخشش، اپنی خوشیاں، اپنی عبادات کی قبولیت۔ یہ خود غرضی کیا رنگ لائے گی؟

ہمارے سرمایہ دار، کارخانہ دار صدقہ وخیرات کرتے نظر آتے ہیں مگر اپنے ملازمین کو معقول تنخواہ نہیں دیتے جس سے ان کا عزت سے گزارا ہو تو اس استحصال کی رقم سے کی گئی خیرات کیا خیر لائے گی؟

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حُور و خیام سے گزر بادہ و جام سے گزر

یہ مہینہ غم خواری کا مہینہ تھا۔ حقوق العباد بھی ایک طرح سے حقوق اللہ ہی ہوتے ہیں۔ سوچیے! اللہ کے بندوں کے لیے کچھ بھی نہ کر کے حقوقِ اللہ کیسے ادا ہو سکتے ہیں؟ اب بھی وقت ہے اس بابرکت مہینے کے آخری عشرہ میں کوئی صدقہ جاریہ ضرور کرلیں۔ خوشیاں بکھیریں، کسی یتیم کے سر پر ہاتھ رکھیں، اس کا سہارا بنیں، دعائیں لیں کہ یتیموں کی دعا عرش تک پہنچتی ہے۔ کسی بے روزگار کو باعزت روزگار کروادیں۔

نئے نئے جوڑے اپنے بچوں کے لیے خریدے ہیں تو کوئی جوڑا کسی یتیم کے لیے بھی خرید کر دیکھیں۔ رب کیسے آپ کی اس عبادت کو قبول کرتا ہے۔۔

ہم الحمدُ للہ مسلمان ہیں تو کیا ایک مسلمان کا فرض نہیں اپنے ہر مسلمان بھائی کا خیال کرے؟ اس کی تکلیف کو محسوس کرے۔

(بقیہ صفحہ نمبر: ۴۷)

سلمان آصف صدیقی[۱]

تزکیۂ نفس

ہمارا عقیدہ عمل میں کیوں نہیں ڈھلتا؟

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ زمین پر اللہ کی بجائے جتنے جھوٹے خداؤں کی عبادت کی جاتی ہے ان میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ وہ خواہشاتِ نفس ہیں جن کی انسان پیروی کرتا ہے۔[۲] بات یہ ہے کہ اپنے نفس کو خدا بنا لینے سے جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ کسی بھی قسم کی اطاعت اور پابندیوں کو بے حد دشوار بنا دیتی ہے۔ ایسی صورت میں مذہب ایک طوق کی علامت معلوم ہوتا ہے اور انسانی تعلقات ایک بوجھ۔ آج یہ دشواری مسلم اور غیر مسلم دونوں کو درپیش ہے۔

خدا اور اس سے تعلق کی تمام بنیادیں اگر عقیدے کی سطح سے گر کر تصور کی سطح پر کھڑی ہوں تو مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہر طرح کا بحران پیدا ہوتا ہے۔ تصور ذہن کی چاردیواری میں رہنے والا بے جان متن ہے۔ اس کو بس سوچا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ عقیدہ وہ قوت ہے جو دل کے احوال اور کیفیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ محسوسات، جذبات، خواہشات کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے اور مرغوبات اور رجحانات کو متعین کرتی ہے۔ تصور کی جان فہم میں ہے اور عقیدے کی جان یقین میں۔ وہ بات جس پر آپ ہرگز شبہ نہیں کر سکتے اور جسے ماننے سے کسی بھی حال میں دستبردار نہیں ہو سکتے وہی عقیدہ ہے اور یہی دراصل کسی بھی شعور کی اساس ہے۔

تناظر (Worldview) کی تشکیل کے لیے عقیدہ اسی طرح کی حیثیت رکھتا ہے جیسے پودے کی پیدائش کے لیے بیج۔ تصور صحیح اور غلط کی تمیز دے سکتا ہے لیکن صحیح کو اختیار کرنا اور غلط سے اجتناب کرنے کی توانائی عقیدے سے پیدا ہوتی ہے۔ عقیدہ انسان کے وجودِ کلّی (Whole self) کی کیفیت کا فعال نگہبان ہے اور تصور ذہن کی دنیا کا ایک قیدی۔ یہ عقیدے سے وفاداری کا نتیجہ ہے، تصور سے نہیں، کہ کوئی انسان اپنا خون، پسینہ اور آنسو کسی

---

[۱] تعلیم و تربیت سے متعلق ادارے ERDC کراچی کے سربراہ

[۲] المعجم الکبیر للطبرانی، رقم الحدیث: ۷۵۰۲

مقصد کے لیے پیش کر دے۔

عقیدے کی تشکیل عموماً مشاہدے، تجربے اور تفہیم کے نتیجے میں ہوتی ہے۔ لیکن ہر دفعہ عقیدے یا یقین تک پہنچنے کے لیے فہم درکار نہیں ہوتا بلکہ کوئی معتبر حوالہ کافی ہو جاتا ہے۔ جب لوگ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر فضا میں سفر کرتے ہیں تو ان سب کو یقین ہوتا ہے کہ یہ ایک محفوظ عمل ہے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کا درست ذریعہ ہے حالانکہ چند ہی مسافر شاید یہ فہم رکھتے ہوں گے کہ یہ سفر کیسے محفوظ ہے۔ اصل میں آپ کے لیے سائنس ایک قابلِ اعتبار حوالہ ہے لہٰذا اس کی یقین دہانی کافی ہو جاتی ہے۔ پھر تجربہ سے بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ یقین درست تھا۔ لیکن پھر کبھی کوئی ایسا حادثہ پیش آتا ہے جس میں ہوائی جہاز مسافروں سمیت کہیں گر جاتا ہے اور لوگ ہلاک ہو جاتے ہیں۔ کبھی حادثہ کی وجہ ماہرین کو سمجھ آ جاتی ہے اور کبھی مختلف اندازے لگا لیے جاتے ہیں۔ سائنس نے یہ دعویٰ کیا کہ ہوائی جہاز کو کبھی حادثہ پیش نہیں آ سکتا، لیکن اس میں سفر کرتے ہوئے لوگوں کے دل میں یہ بات نہیں ہوتی کہ یہ جہاز دورانِ سفر گر بھی سکتا ہے۔ ہوائی جہاز کا سفر جاری رہتا ہے۔

دین ہمارے پاس انتہائی معتبر حوالے سے پہنچا ہے۔ اس کی بہت سی باتیں فہم میں آسانی سے آ جاتی ہیں۔ لیکن یہ باتیں فہم میں آئیں یا نہ آئیں کیا ہمارے لیے اس معتبر حوالے کی بھی کوئی حیثیت ہوگی۔ اگر آپ کا انتہائی قابلِ اعتماد دوست آپ کو کسی کام کے لیے ایک لفافہ دے کر آپ کو یہ بتائے کہ اس میں دس لاکھ روپے ہیں تو آپ کے لیے اس لفافہ میں سے روپے نکال کر گننا ضروری نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ یہ حوالہ آپ کے لیے معتبر ہے۔ آپ کو ایک انتہائی معتبر ہستی نے یہ بتایا ہے کہ کراماً کاتبین آپ کا ہر عمل لکھ رہے ہیں۔ آپ کو نہیں معلوم کہ وہ کون سے کاغذ پر، کس قلم سے اور کس زبان میں لکھ رہے ہیں؟ ان کی لکھائی کیسی ہے؟ یہ تھکتے کیوں نہیں؟ اتنا سارا لکھا ہوا کہاں اور کیسے محفوظ ہو رہا ہے؟ آپ کے پاس ان تفصیلات کا فہم نہیں ہے لیکن اس علم الغیب کو یقین میں بدلتے ہی زندگی بدل جاتی ہے۔

اسی طرح جب ڈاکٹر کسی مریض کو کوئی دوا دیتا ہے تو مریض کو اس بات کا فہم نہیں ہوتا کہ یہ دوا کیسے اس کی بیماری کا علاج کرے گی۔ اس کے لیے سائنس ایک معتبر حوالہ ہے جس نے

ان صاحب کو ڈاکٹر قرار دیا ہے۔ اگر وہ ڈاکٹر کی دی ہوئی دوا کھائے اور بیماری دور نہ ہو تو بھی وہ ڈاکٹر سے اپنا علاج کروائے گا۔ سائنسی تحقیقات نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ اگر مریض کو طریقۂ علاج یا دوائی پر اعتبار اور یقین نہ ہو تو وہ اس کے علاج میں کارگر ثابت نہیں ہوتے۔ بلکہ مصنوعی دوا (Placebo Medicine) کے تجربوں سے تو مزید حیرت انگیز انکشافات ہوئے ہیں۔ اگر کوئی مریض جو دوا پر یقین رکھتا ہے ایک ایسی چیز جو دوا کے روپ میں تو ہے لیکن حقیقتاً کچھ نہیں ہے کھالے تو وہ بھی اس کے اوپر کارگر ہو جاتی ہے۔ دل کا یقین اور اعتماد ہماری نفسیاتی بناوٹ متعین کرنے میں دوسرے تمام عوامل کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ یہ ہمارے پورے وجود کو اپنی تحویل میں رکھ سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جب اعلانِ نبوت کیا اور دین کی دعوت لوگوں کے سامنے رکھی تو یہ بہت منطقی اور اصولی طور پر ذہن کے لیے آسان فہم بات تھی۔ لیکن جب نبوت کے دسویں سال واقعۂ معراج پیش آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آسمانوں کی سیر پر تشریف لے گئے، تو یہ بات لوگوں کے لیے ماورائے عقل اور ناقابل یقین تھی۔ ابوجہل نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اس سفر کا ذکر کرتے سنا تو سیدھا حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچا۔ اسے یقین تھا کہ حضرت ابوبکرؓ ایسے دعوے کو تسلیم نہیں کر پائیں گے۔ اسی امید کے ساتھ اس نے حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا کہ دیکھو تمہارے صاحب کیسی عجیب بات بتا رہے ہیں کیا تم اس پر بھی یقین کر لو گے؟ حضرت ابوبکرؓ نے جنہیں اس واقعہ کا علم ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے نہیں ملا تھا، پہلے یہ سوال کیا کہ کیا یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمائی ہے، جس کا ابوجہل نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر آپ نے بغیر کسی توقف کے ایک جملہ کہا جو ہر مسلمان کے عقیدے کی اصولی بنیاد ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ابوجہل کو جواب دیا کہ اگر یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمائی ہے تو پھر بالکل صحیح ہے، ایسا ہی ہوا ہوگا۔ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو نبی ماننے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی کسی بھی بات پر یقین کرنا مشکل نہیں۔ اللہ کو قادرِ مطلق ماننے والے کے لیے کسی بھی معجزے پر حیران ہونا مناسب نہیں۔

مسلمان جھوٹے خداؤں کو شعوری طور پر اپنا ربّ نہیں بناتا لیکن لاشعوری طور پر ان کی مرعوبیت میں مبتلا میں ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کا عقیدہ کمزور ہو کر تصور کی سطح پر گر

جاتا ہے اور اسے احساس بھی نہیں ہوتا۔قرآن نے مختلف مواقع پر اس طرف توجہ دلائی ہے کہ صرف اللہ کا تقویٰ اختیار کیا جائے۔یعنی صرف اللہ کا رعب اور اس کی عظمت کو دل میں زندہ رکھا جائے اور کسی دوسری چیز سے اپنے دل کو متاثر یا مرعوب نہ ہونے دیا جائے۔قرآن کی اس بات کا ایک مطلب یہ ہے کہ کسی اور کا تقویٰ اختیار کیے جانے کا امکانی خطرہ انسان کے نفس میں موجود ہے۔غور کرنے کی بات یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرنے کی ہدایت صرف مسلمانوں کو کی گئی ہے۔

عقیدے کا انسان کی نفسیاتی کیفیت سے بہت گہرا تعلق ہے۔اگر کبھی کسی واقعہ میں آپ کے رونگٹے کھڑے ہوئے ہوں، یا کسی خاص صورت حال میں سلامتیٔ صحت کے ساتھ دل کی دھڑکن تیز ہوتے ہوئے محسوس کی ہو، یا کسی بات کو سن کر کبھی سکتہ چھا گیا ہو، یا کسی معاملہ میں شدتِ جذبات سے آواز بھرائی، یا آنکھیں نم ہوئیں، یا ماتھے پر پسینہ آ گیا، یا کبھی کسی فکر میں نیند یا بھوک اُڑ گئی،تو یہ سب مظاہر کسی بات کا یقین یا کسی حقیقت کا تجربہ کرنے سے پیدا ہوئے ہیں۔عقیدے کا ایسا ہی معاملہ ہے۔ یہ ہمارے مادی وجود کے ایک ایک خلیہ سے لے کر ہمارے روحانی وجود کی گہرائیوں تک اثر انداز ہوتا ہے۔لیکن یہ حال صرف اس وقت نصیب ہوتا ہے جب عقیدہ راسخ ہو۔حقیقتوں کو صرف تصور کی سطح پر قبول کرنے سے یہ بات نہیں بنتی۔ اگر کسی مسلمان کے فکرِ آخرت میں آنسو نہیں نکلتے یا جوابدہی کے احساس سے دل میں رقّت پیدا نہیں ہوتی تو یہ اس کے لیے بڑی پریشانی کی بات ہونی چاہیے۔عقیدہ چونکہ پورے وجود پر اپنا اثر پیدا کر دیتا ہے لہٰذا روزِ محشر ہمارے وجود کے تمام اعضاء و جوارح ہمارے ایمان کی بابت ناقابل تردید شہادتیں پیش کر دیں گے۔

آج کے مسلمان کا سب سے بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اللہ اس کا تصور ہے عقیدہ نہیں۔ آخرت، جنت اور جہنم سب تصور کی سطح پر گر چکے ہیں۔اسی لیے یہ تذکرے اس کے وجود کو جھنجوڑتے نہیں۔نفس کا سب سے قابلِ اعتبار چوکیدار عقیدۂ آخرت ہے،تصورِ آخرت نہیں۔ مغرب میں علوم شک کی بنیاد پر پیدا ہوتے ہیں۔عقیدہ شک کا متحمل نہیں ہوسکتا۔مغرب عقیدے کو ایک بوجھ اور علم دشمن خیال کرتا ہے۔مغربی علوم کا مسکن ذہن ہوتا ہے۔دین میں علوم یقین کے بیج سے پھوٹتے ہیں اور ان کی جڑیں قلب میں واقع ہوتی ہیں۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔جب مصر فتح ہوا تو مصر والے

بوائی کے مہینے میں فاتحِ مصر حضرت عَمرو بن عاصؓ کے پاس آئے اور کہنے لگے ہماری قدیم روایت ہے کہ اس مہینے میں کسی کو دریائے نیل کی بھینٹ چڑھاتے ہیں اور اگر نہ چڑھائیں تو دریا میں پانی نہیں آتا۔ ہم ایسا کرتے ہیں کہ اسے مہینے کی بارہویں تاریخ کو ایک باکرہ لڑکی کو جو اپنے ماں باپ کی اکلوتی ہو اس کے والدین کو دے دلا کر رضامند کر لیتے ہیں اور اسے بہت عمدہ کپڑے اور بہت قیمتی زیور پہنا کر بنا سنوار کر اس نیل میں ڈال دیتے ہیں تو اس کا بہاؤ چڑھتا ہے ورنہ پانی چڑھتا ہی نہیں۔ حضرت عمرو بن عاصؓ نے جواب دیا کہ یہ ایک جاہلانہ اور احمقانہ رسم ہے۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام تو ایسی چیزوں کو ختم کرنے کے لیے آیا ہے تم اب ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ باز رہے لیکن دریائے نیل کا پانی نہ چڑھا۔ پورا مہینہ نکل گیا لیکن دریا خشک رہا۔ لوگ تنگ آ کر ارادہ کرنے لگے کہ مصر کو چھوڑ دیں۔ اب فاتحِ مصر کو خیال آیا کہ خلیفہ کو اس کی اطلاع دیں۔ حضرت عمرؓ نے یہ معاملہ سن کر دریائے نیل کے نام ایک خط لکھا جس میں تحریر تھا کہ اے دریائے نیل اگر تُو اللہ کے حکم سے بہتا ہے تو ہم اللہ سے تجھے جاری کرنے کی دعا کرتے ہیں اور اگر تُو کسی اور کے حکم سے بہتا ہے تو ہمیں تیری کوئی ضرورت نہیں۔ حضرت عمرؓ کا یہ خط دریا میں ڈالا گیا۔ ابھی ایک رات بھی گزرنے نہیں پائی تھی کہ دریائے نیل میں پانی چڑھ آیا۔

اس واقعہ میں غور کرنے کے کئی پہلو ہیں۔ پہلی بات یہ کہ انسان کے دل میں جھوٹے خداؤں یا بتوں سے توقعات کی صورت کیسی ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب انسان اپنی امیدیں بتوں سے وابستہ کر لیتا ہے یا کسی غلط عقیدے کو اختیار کر لیتا ہے تو اللہ بھی اس کو ایک اور امتحان میں ڈال دیتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ حالات کو اس کے گمان کے مطابق ڈھال دیتے ہیں۔ اگر عقیدے کی خرابی کے ساتھ زندگی کی گاڑی چلنا شروع کر دے تو انسان گمراہیوں کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کے عقیدے کی اصلاح اپنے عقیدے کی قوت سے کی، اپنی ابلاغ کی صلاحیت سے نہیں اور پھر لوگوں نے دیکھ لیا کہ دریا میں پانی تو صرف اور صرف اللہ کی قدرت ہی سے آتا ہے۔

جب کرونا وائرس آیا تو اس سے پیدا ہونے والی صورتحال نے یہ دکھایا ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی نفسیاتی کیفیت میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ دونوں کی نفسیاتی کیفیت کا اگر

کوئی اسکین (Scan) ممکن ہوتا یا کوئی ایسی مشین ہوتی جس میں دونوں کی نفسیات (Psyche) ڈالتے اور اس کی کوئی رپورٹ یا تصویر ممکن ہوتی تو شاید اس میں کسی بھی سطح پر کوئی فرق نہ نکلتا۔ یہ بڑی افسوسناک بات ہے۔ اگر مسلمانوں کی اپنے عقیدے سے وابستگی پکی ہوتی اور ان کا ایمان مضبوط ہوتا تو وہ اس صورتحال میں حواس باختہ، پریشان اور خوف کا شکار نہ ہوتے۔ انہیں اس بات کا یقین ہوتا کہ اللہ انہیں بے سہارا نہیں چھوڑے گا۔

کرونا وائرس سے موت کا شکار ہونے والوں کے جنازوں میں لوگ شرکت نہیں کرتے تھے، چاہے وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ دونوں کو یہ خوف تھا کہ کہیں مُردے کے جسم سے ان میں وائرس نہ منتقل ہو جائے۔ دونوں کے عمل کی بنیاد ایک ہو گئی تھی۔ کیسا مقام ہے کہ سائنس کی بے بسی کو دیکھ لینے کے بعد بھی ہم سائنس ہی میں پناہ لینے کے خواہاں ہیں۔ وہ سائنس جو صرف مادی حقیقتوں کا بھی پوری طرح احاطہ نہیں کر پائی اس کے مفروضوں کو اس خالق کی یقین دہانیوں پر فوقیت حاصل ہو گئی جو مادی اور غیر مادی ہر شے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اصل مسئلہ وائرس کا نہیں تھا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہم نے نہ اپنے وجود کی اصل کو پایا نہ اپنے حقیقی خدا کو۔ ہم نے روح کے انکاریوں کی تقلید میں اپنے جسموں ہی کو اپنے وجود کی اصل سمجھ لیا تھا۔

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کرونا وائرس خدا کا عذاب تھا یا آزمائش۔ قرآن نے یہ قانون بتا دیا کہ انسانوں پر جو بھی مشکل آتی ہے وہ دراصل ان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے یعنی زمین پر آنے والے مصائب انسان کی فطرت سے بغاوت یا پھر اللہ کی نافرمانی کا نتیجہ ہوتے ہیں:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٤١﴾﴾ [الروم ۳۰:۴۱]

''لوگوں نے اپنے ہاتھوں جو کمائی کی، اس کی وجہ سے خشکی اور تری میں فساد پھیلا تاکہ انہوں نے جو کام کیے ہیں اللہ ان میں سے کچھ کا مزہ انہیں چکھائے، شاید وہ باز آجائیں۔''

ابراہیم بن ادہمؒ جب اندھیری گھٹاؤں اور بادلوں کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھتے تو فرماتے کہ یہ سب میرے گناہوں کی وجہ سے ہے، اگر میں یہاں سے چلا جاؤں تو تمہیں اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اگر ابراہیم بن ادہمؒ کا یہ حال تھا تو ہماری حالت کیا ہونی چاہیے؟

بات یہ ہے کہ اگر کسی مشکل نے انسان کو توبہ، استغفار اور صبر کی طرف مائل کیا ہے تو یہ آزمائش ہے اور اگر اس مشکل نے اسے اللہ سے غافل کیا ہے تو وہ عذاب ہے۔ مشکل اگر رجوع الی اللہ کا سبب بن جائے تو اس میں بڑی خیر ہے۔ اللہ کسی بھی حال میں اپنے بندوں پر نامہربان نہیں ہوتا۔

حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں جب سیلاب آیا تو انہوں نے اپنے بیٹے کو اللہ کی طرف بلایا۔ اس نے کہا کہ یہ پہاڑی بڑی ہے، میں اس پر پناہ لے کر خود کو بچا لوں گا۔ لیکن وہ پہاڑی پر ہونے کے باوجود سیلابی ریلے سے نہ بچ سکا اور صرف وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی طرف رجوع کیا وہ بچ گئے۔ یہ سیلاب کچھ لوگوں کے لیے عذاب اور کچھ لوگوں کے لیے آزمائش ثابت ہوا۔

مسلمانوں کو ایک بات اچھی طرح بتا دی گئی ہے کہ ان کے ایمان کی مختلف مواقع پر آزمائش کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا انہیں کسی بھی قسم کی مشکل کو اسی تناظر میں دیکھنے کے لیے تیار رہنا چاہیے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿155﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿156﴾﴾ [البقرہ ۲: ۱۵۵، ۱۵۶]

''اور دیکھو ہم تمہیں آزمائیں گے ضرور، (کبھی) خوف سے اور (کبھی) بھوک سے (کبھی) مال و جان اور پھلوں میں کمی کر کے اور جو لوگ (ایسے حالات میں) صبر سے کام لیں ان کو خوشخبری سنا دو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم سب اللہ ہی کے ہیں اور ہم کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

مسلم اور غیر مسلم کے شعور اور نفسیاتی کیفیت میں یکسانیت ہونے کی ایک بڑی وجہ ان کے تصورِ علم کا امتیاز مٹ جانا ہے۔ مسلمان کو اکتسابِ علم کا فریضہ اس احساسِ ذمہ داری سے انجام دینا تھا کہ دو اصول ہر حال میں مقدم رہیں۔ پہلا: وہ علم علمِ نافع ہو اور دوسرا کسی بھی علم پر وحی کے علم کو حکم کا درجہ حاصل رہے گا اور دیگر علوم کو پرکھنے اور جانچنے کی ذمہ داری دینی علم کے پاس رہے گی۔

سائنس کے حاصلات اور میڈیا کے ابلاغ کا بڑا حصہ اس علم پر مشتمل ہے جسے علمِ نافع

نہیں کہا جاسکتا۔ مسلم اور غیر مسلم کے شعور کی مجموعی پرورش بِلا امتیاز اسی علم غیر نافع سے ہوئی ہے۔ عہدِ جدید کے سیلابِ معلومات میں آج کا انسان دلچسپ اور غیر دلچسپ کی چھلنی (Filter) لگا کر مزے دار معلومات نگلتا جا رہا ہے۔ مغربی دنیا کا ایک مفکر نیل پوسٹ مین (Neil Postman) کہتا ہے کہ معلومات کی زیادتی معلومات کی کمی سے زیادہ بڑا مسئلہ ہے کیونکہ کثرتِ معلومات کی وجہ سے انسان نافع اور غیر نافع، مصنوعی اور غیر مصنوعی اور معنوی اور غیر معنوی کی تمیز سے محروم ہو جاتا ہے۔

اسلام کے تناظر میں وہ علم جو انسان پر اس کی اور کائنات کی حقیقت اس طرح کھول دے کہ اسے اللہ کا یقین اور اس کی معرفت حاصل ہو جائے وہی علم نافع ہے۔ علم نافع کی ایک اصولی اور واضح تعریف سامنے نہ رکھنے کے نتیجے میں مسلم شعور اور نفسیات کو یہ نقصان پہنچا کہ اس میں اور غیر مسلم کے شعور میں کوئی جوہری فرق نظر نہیں آتا۔ مسلمان کو اپنی وجودی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے علم غیر نافع کی تین بڑی علامتوں کو پہچاننا ضروری ہے:

* وہ علم جو میرے ایمان، اخلاق، ذہن اور اعصاب کے لیے مضر ہو۔

* وہ علم جو میرے لیے موت کو ناپسندیدہ اور اوجھل کر کے بندگی کے تقاضے نبھانا دشوار کر دے۔

* وہ علم جو تعلق کی پانچ جہتوں میں میرا جو ہرِ تعلق متاثر کر دے۔ یہ پانچ جہتیں اپنے ساتھ تعلق، خدا کے ساتھ تعلق، اپنوں کے ساتھ تعلق، دوسروں کے ساتھ تعلق اور فطرت کے ساتھ تعلق کی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ اللہ کا خوف حکمت کی جڑ ہے۔[۱] اس کا مطلب یہ ہوا کہ دین کے تناظر میں حکمت خالص ایمانی تناظر میں تشکیل پانے والے فہم کا عنوان ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے[۲] عصری پیمانے کے مطابق ذہین اور سمجھ دار انسان وہ ہوتا ہے جو اس

---

[۱] البیہقی فی شعب الایمان، رقم الحدیث: ۷۴۴

[۲] البیہقی فی شعب الایمان، رقم الحدیث: ۱۰۰۱۹

عارضی زندگی کے مفادات کا بخوبی تحفظ کر سکے۔ دین کی نگاہ میں اگر اس انسان کے اندر اللہ کے حضور جوابدہی کا خوف موجود نہیں تو اپنی ساری عقل اور صلاحیت کے باوجود وہ ایک بے وقوف انسان ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ عہد جدید میں، خدائے واحد کو ماننے والے اور اس کا انکار کرنے والے، دونوں کے نزدیک ایک ہی طرح کا انسان عقلمند اور کامیاب ٹھہرا ہے۔

قرآن میں اس بات کی نشاندہی کردی گئی ہے کہ اللہ دنیا اور اس کے ساز وسامان کو دلکش بنا کر انسانوں کا امتحان لے رہا ہے:

﴿إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۝٧﴾

[الکہف ۱۸:۷]

''یقین جانو کہ روئے زمین پر جتنی چیزیں ہیں ہم نے انہیں زمین کی سجاوٹ کا ذریعہ اس لیے بنایا ہے تاکہ لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون زیادہ اچھا عمل کرتا ہے۔''

وہ انسان جو اللہ سے محبت کا دعویدار تو ہے لیکن اللہ کے ڈر سے خالی ہے، نہ صرف محبت کے حقیقی تجربے سے ابھی دور ہے بلکہ اللہ کو بھی اس طرح تسلیم نہیں کر پایا جیسا کہ اس کا حق ہے۔ وہ انسان جو اللہ سے ڈرتا تو ہے لیکن اس سے پُر امید نہیں ہے، اللہ کو اس طرح نہیں پہنچانتا جیسا کہ اس کا حق ہے۔ انسانی نفسیات میں اللہ کے حوالے سے خوف، محبت اور دوسرے جذبات عقیدے کی صحت اور اس سے وفاداری کے نتیجے میں ہی ٹھیک رہ سکتے ہیں۔

اللہ کا خوف دراصل اللہ سے محبت کا دوسرا رُخ ہے۔ تعلق کی سچائی انسان میں امید اور خوف کی یکجائی پیدا کردیتی ہے۔ خوف یہ کہ کہیں وہ مجھے میرے حال پر چھوڑ نہ دے، کہیں مَیں اس سے دور نہ ہو جاؤں، کہیں وہ مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔ امید یہ کہ وہ میری توبہ قبول کر کے مجھے معاف کردے گا، مجھے بے سہارا نہیں چھوڑے گا، مجھ پر رحم فرمائے گا اور میری مشکلات حل کردے گا۔ اللہ سے تعلق کے نتیجہ میں انسان بیم ورجاء کی اسی کیفیت میں رہتا ہے جو اسے منکرات سے بچاتی اور نفسیاتی قوت عطا کرتی ہے۔ یہی خوف اور محبت کا باہمی احساس مسلمان میں روزِ حشر جوابدہی اور شرمندگی سے بچنے کی فکر پیدا کردیتا ہے۔

(بقیہ صفحہ نمبر: ٦٤)

تفہیم دین مدیر

استفتاء

قادیانیوں کی عدمِ تکفیر کے حوالے سے جاوید غامدی صاحب اوران کے حمایتیوں کے بارے میں حکمِ شرعی

ہمیں ایک استفتاء موصول ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

''مَیں یہ استفتاء کئی دینی مدارس کے دارالافتاء کو بھیج رہا ہوں۔ آپ سے بھی استدعا ہے کہ مندرجہ ذیل تین سوالات کے بارے میں میری رہنمائی فرمائیں:

۱۔ ساری ملت اسلامیہ اوراس کے علماء ومفتی حضرات اورخصوصاً پاک وہند کے علماء کرام قادیانیوں کوختم نبوت کوتسلیم نہ کرنے اورمرزاغلام احمد کونبی اوررہنما ماننے کی وجہ سے غیر مسلم اورمرتد سمجھتے ہیں اوران کی تکفیر کے قائل ہیں۔ پاکستان کی پارلیمنٹ اورحکومت نے بھی انہیں غیر مسلم قرار دیا ہے اوراس کے لیے آئین میں خصوصی ترمیم اورقانون سازی کی ہے۔ لیکن معروف متجدد جاوید احمد غامدی صاحب ان کی تکفیر کے قائل نہیں اوراپنا نقطۂ نظر پاکستان میں سوشل میڈیا پرخوب پھیلا رہے ہیں۔سوال یہ ہے کہ غامدی صاحب اوران کے اس مؤقف کے بارے میں حکمِ شرعی کیا ہے؟

۲۔ غامدی صاحب کے جو تلامذہ اورحمایتی ان کی اس عدمِ تکفیری مؤقف کی کھل کرتو حمایت نہیں کرتے لیکن بالواسطہ طور پراس کی حمایت کے لیے پرجوش طریقے سے کام کررہے ہیں جیسے کہتے ہیں کہ فلاں اورفلاں بھی تو قادیانیوں کی تکفیر کے قائل نہ تھے یا تصوف میں تو فلاں اورفلاں نے اس قسم کا نعرہ لگایا تھا یا کہیں گے کہ غامدی صاحب کا مطلب دراصل یہ تھا، وہ نہیں تھا۔ مطلب یہ کہ وہ بالواسطہ طور پرغامدی صاحب کے مؤقف کی حمایت کرتے ہیں اور مسلمان عوام کوکنفیوز کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں حکمِ شرعی کیا ہے؟

۳۔ بعض لوگ غامدی صاحب اوران کے حمایتیوں کے دینی امور میں اختلاف کو

معمول کا اختلاف سمجھتے ہیں جیسے احناف اور شافعیہ میں ہے یا دیگر علماء میں بین المسالک ہوتا ہے جبکہ غامدی صاحب اور ان کے حمایتیوں کا مسلمانوں سے اختلاف معمول کا اختلاف نہیں ہے بلکہ وہ کئی ایڈ لائنیز کو عبور کر چکے ہیں۔ مثلاً امت جسے سنت رسول سمجھتی ہے، وہ اسے سنت نہیں سمجھتے۔ وہ قرآن کے صحیح فہم کے لیے نظم کو شرط قرار دیتے ہیں۔ وہ رجم کا انکار کرتے ہیں، آمد مسیح کا انکار کرتے ہیں، اسلامی ریاست کا انکار کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اسلام کے ہر معاملے کی وہ تشریح کرتے ہیں جو مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کے مطابق ہو۔ غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ وحمایتیوں کے بارے میں یہ ہمدردانہ نقطۂ نظر رکھنے والے سکالرز و علماء کے مؤقف کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب: ان امور کے بارے میں فتویٰ تو جامعات کے دارالافتاء کے محققین ہی دے سکتے ہیں اور دیں گے۔ ہم مفتی نہیں کہ فتویٰ دیں، البتہ دین کا ایک طالب علم ہونے کے ناتے اس بارے میں ہماری جو رائے ہے وہ ہم قارئین کے غور و فکر کے لیے ان کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔

سوال نمبر ۱: جاوید غامدی صاحب

جاوید غامدی صاحب کے گمراہ ہونے کا فیصلہ پاکستان کے اکثر علماء کرام دے چکے ہیں۔ ملی مجلس شرعی کے سارے دینی مکاتب فکر کے علماء کرام نے بھی یہی فیصلہ دیا تھا۔ بعض جامعات کے دارالافتاء نے ان کی تکفیر بھی کی تھی۔ یہ قادیانیوں والے مسئلے میں ان کے عدم تکفیر سے پہلے کی بات ہے۔ اب جو نئی صورتِ حال پیدا ہوئی ہے، اس میں بہتر یہی ہے کہ مفتی حضرات اس کے بارے میں فیصلہ کریں۔ ہم ان شاء اللہ ملی مجلس شرعی میں بھی اسے اٹھائیں گے۔

سوال نمبر ۲: غامدی صاحب کے تلامذہ اور حمایتی

غامدی صاحب کے تلامذہ اور ان کے حمایتی معاشرتی دباؤ کی وجہ سے اس کی ہمت تو نہیں کر رہے کہ ان کی عدم تکفیر کے مؤقف کو صاف صاف اپنائیں لیکن صاف نظر آ رہا ہے کہ وہ

حیلے بہانے اور بالواسطہ طور پر ان کی حمایت مسلسل کررہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ غیر مسلم تو ہیں لیکن یہ ڈیکلیئر کرنا ریاست کا کام نہیں اور یہ علماء کا کام بھی نہیں۔ یا یہ کہ وہ غیر مسلم تو ہیں لیکن ان کو ان کے مذہب پر عمل نہ کرنے دینا ان کے بنیادی حقوق غصب کرنا ہے اور یہ ان پر ظلم کے مترادف ہے۔ یا فلاں اور فلاں عالم بھی تو قادیانیوں کو غیر مسلم کہنے میں متردد تھے یا پہلے بھی صوفیاء اس طرح کی غیر سنجیدہ باتیں کہتے رہے ہیں لیکن امت نے انہیں غیر مسلم قرار نہیں دیا۔ یا کسی فرد کو تو غیر مسلم کہا جاسکتا ہے کسی گروہ اور جماعت کی اجتماعی تکفیر نہیں کی جاسکتی....وغیرہ۔

یہ ساری باتیں غامدی صاحب کے شاگرد اپنے لٹریچر میں اور سوشل میڈیا پر ماضی میں بھی کرتے رہے ہیں اور آج بھی کررہے ہیں اور مقصد ان سب کا ایک ہی ہے یعنی غامدی صاحب کے مؤقف کی بالواسطہ طور پر حمایت کرنا، ان کے مؤقف کی شناعت کم کرنا اور ان کے مؤقف کو قابل قبول قرار دینا۔ امت کو باور کرانا کہ غامدی صاحب کی بات بلا جواز نہیں۔ اس پر غور تو کرو، اسے فوراً ردّ نہ کرو۔ اس کے حق میں دلائل بھی موجود ہیں....وغیرہ وغیرہ۔

مزید برآں غامدی صاحب کی تین بنیادی باتیں ایسی ہیں جو ان کی گمراہی کا زندہ ثبوت ہیں اور جو اُن کی اِن باتوں کو صحیح سمجھتا ہے اس کے گمراہ ہونے میں بھی کوئی شک نہیں۔ ایک یہ کہ وہ قرآن وسنت کی من مانی تشریح کرتے ہیں جو مسلمانوں کی چودہ سو سالہ علمی روایت میں آج تک کسی نے نہیں کی۔ وہ سنت کا انکار واستخفاف اور قرآن کے صحیح مفہوم کو نظم سے مشروط کرتے ہیں اور یوں دین کی ایک نئی تعبیر پیش کرتے ہیں۔

دوم: وہ امت کی چودہ سو سالہ علمی روایت کو ردّ کرتے ہیں۔ بہت سی وہ باتیں جن پر امت کا اور علماء امت اور مجتہدین کا اجماع ہے یا وہ امت کے جمہور علماء (یعنی ہر زمانے کے علماء وفقہاء کی اکثریت) کا مؤقف رہا ہے، غامدی صاحب ان سب کو ردّ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ دین کو نہیں سمجھے اور صحیح رائے صرف وہ ہے جو مَیں پیش کررہا ہوں۔ کسی ایک آدھ بات میں تو یہ تفرد برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن یہ کہنا کہ ساری امت اور اس کے علماء دین کو صحیح نہیں سمجھے اور صحیح وہ ہے جو آج مَیں کہہ رہا ہوں، یہ نقل کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی۔

تیسری: بات یہ کہ امت اور اس کے جلیل القدر علماء ہر عہد میں غیر منصوص امور میں اجتہاد کے قائل رہے ہیں (قدماء اس کے لیے 'قیاس' اور 'اجماع' کی اصطلاحات بھی استعمال کرتے رہے ہیں) لیکن یہ اجتہاد ہمیشہ قرآن وسنت کی نصوص کی روشنی میں ہوتا رہا ہے یا ان شرعی ادلہ کے ذریعے جو قرآن وسنت سے مستنبط ہیں جیسے شرع من قبلنا، اجماعِ صحابہ، قیاس، استحسان، سدا ندرائع، مصالح مرسلہ وغیرہ۔ اجتہاد دین میں آزادانہ رائے قائم کرنے کا نام نہیں۔ آزادانہ رائے قائم کرنے کو یا کسی اور دین/تہذیب/قوم کی رائے کو قبول کرنے کو جس کی اصل قرآن وسنت میں نہ ہو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے مردود قرار دیا ہے۔ آپ نے فرمایا "من احدث فی امرنا ھذا لیس منہ فھو ردّ" ① یعنی جو شخص ہمارے دین میں اس چیز کا اضافہ کرے جس کا اصل اس میں نہ ہو (یعنی قرآن وسنت میں)، وہ اور اس کا مؤقف مردود ہے، قابل ردّ ہے، قابل قبول نہیں ہے۔ خود ہم البرہان میں ثابت کر چکے اور دوسرے کئی اہل علم بھی کہ غامدی صاحب دین کی جو تشریح کرتے ہیں وہ مغرب کی الحادی فکر وتہذیب پر مبنی ہوتی ہے اور اس فکر وتہذیب کا خلاف اسلام ہونا البداہت واضح ہے اور جس کے علمبردار اہل مغرب کا اسلام اور مسلمانوں کا دشمن ہونا ہم سب کا مشاہدہ ہے لہٰذا غامدی صاحب کے سارے اجتہادات اور ان کی ساری آراء الحادی فکر وتہذیب پر مبنی ہونے کی وجہ سے اصولاً قابل ردّ ہیں، خلافِ شرعِ متین ہیں اور انہیں قبول نہیں کیا جا سکتا۔

اور جب غامدی صاحب کا منہج فکر ان تین غلط بنیادوں پر قائم ہے تو ان کی گمراہی میں کوئی شک نہیں رہ جاتا اور کسی گمراہ شخص کی پیروی کرنا، اس کے مؤقف کو صحیح سمجھنا اور اسے امت کو سچ باور کرانا، ظاہر ہے یہ بھی گمراہی ہے اور کسی گمراہ شخص کی پیروی کرنا جائز نہیں اور نہ ایک اسلامی معاشرے اور ریاست میں ان امور کی اجازت ہونی چاہیے اور نہ انہیں کھلی چھوٹ دی جانی چاہیے کہ وہ اپنے گمراہ کن نظریات کا پروپیگنڈا کرتے رہیں اور لوگوں کو گمراہ کرتے رہیں۔

سوال نمبر ۳: غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ کے ہمدرد اور ان کی تحسین کرنے والے

بعض سکالرز اور علماء خوش فہمی سے (درحقیقت غلط فہمی سے) یہ سمجھتے ہیں کہ غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ جدید مغرب زدہ طبقے کو دین سمجھا رہے ہیں اور دین کی بڑی خدمت

کرر ہے ہیں۔ روایتی علماء محض اپنی قدامت پرستی کی وجہ سے ان کی مخالفت کرتے ہیں جبکہ غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ کا ان سے اختلاف ایسا ہی ہے جیسا مسلمانوں میں بین المسالک ہوتا ہے اور یہ مباح ہے بلکہ بعض لحاظ سے مفید ہوتا ہے۔ اس لیے وہ غامدی صاحب کے تلامذہ کی قدردانی کرتے ہیں، ان کو اچھا سمجھتے ہیں اور ان سے دوستانہ تعلقات رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب نہ صحیح ہے اور نہ مطابق شریعت ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم نے سطور سابقہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ غامدی صاحب گمراہ ہیں اور پاکستان کے علماء اور سکالرز کی غالب تعداد انہیں گمراہ سمجھتی ہے۔ لہٰذا غامدی صاحب کے تلامذہ اور ہم خیال افراد بھی گمراہ ہیں۔ وہ لوگوں کو صحیح دین سے دور کرر ہے ہیں، ان کے اندر مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کی غلامی اور مرعوبیت پیدا کرر ہے ہیں اور انہیں اسلام کی چودہ سوسالہ علمی روایت سے کاٹ کر مغرب کے فکری غلام بنا رہے ہیں جیسا کہ ہم نے سوال نمبر ا کے جواب میں بتایا کہ غامدی صاحب کا تصور دین جمہور علماء سے بالکل مختلف ہے اور وہ دین کے جذور میں، قرآن وسنت کے بنیادی تصورات میں جمہور علماء وجمہور امت کے مخالف ہیں۔ وہ سنت کا انکار واستخفاف کرتے ہی اس لیے ہیں تا کہ وہ قرآن کو اپنی مرضی کے معانی پہنا سکیں اور ان کا یہ کہنا کہ قرآن کو اس کے نظم کے بغیر صحیح نہیں سمجھا جا سکتا، بھی اسی لیے ہے۔ دین کی چودہ سوسالہ علمی روایت کا انکار بھی وہ اسی وجہ سے کرتے ہیں تا کہ دین کے اصول واقدار کو وہ اپنی مرضی کے مفہوم کا جامہ پہنا سکیں۔

ان حالات میں غامدی صاحب کے تلامذہ اور حمایتیوں کی سرگرمیوں کو دینی سمجھنا یا دین کے لیے مفید سمجھنا غلط بھی ہے اور خطرناک بھی۔ یہ دین کی ایک غلط تعبیر کو فروغ دینا ہے، یہ مغرب پرستی اور مسلم معاشرے میں گمراہ کن نظریات کے فروغ کی کوششوں کی تائید وحمایت کرنے کے مترادف ہے۔ گمراہی کی تائید کو گمراہی ہی کہا جا سکتا ہے، اس کی تحسین تو نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے ہماری ان اہلِ علم سے درخواست ہے جو غامدی صاحب کے تلامذہ سے دوستیاں رکھتے ہیں، ان کو صاحب علمٍ اور روشن خیال اسکالر سمجھتے ہیں کہ وہ اس خوش فہمی یا غلط فہمی سے باز آجائیں اور اس چیز کا ادراک کرنے کی کوشش کریں کہ عصر حاضر میں مغربی فکر وتہذیب کی اسلام کے مقابلے میں بالا دستی اور ترویج اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج اور

فتنہ ہے۔ جو اسلام اور مسلمانوں کی بقاء واستحکام کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مغرب کی الحادی فکروتہذیب سے 'محتاط استفادے' کے نام پر مغرب کی فکری یلغار میں بہہ جانے سے بچا جائے بلکہ اسلام پر استقامت اختیار کی جائے اور مغربی فکروتہذیب کو سراہنے والوں اور ان کے حمایتیوں کو ردّ کیا جائے۔ غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ کا تصورِ دین ان کے 'فکری افلاس' کا مظہر ہے جبکہ مسلم امہ کی ضرورت اس وقت 'فکری استقلال' کی ہے تا کہ مسلمان زوال سے نکل سکیں اور غیر اسلامی مغربی افکار وتصورات کو ردّ کر کے اسلام کے حیات آفرین اصول واقدار پر عمل کرسکیں۔ وآخر دعوانا ان الحمدللّٰہ ربّ العلمین۔

بقیہ: ہمارا عقیدہ عمل میں کیوں نہیں ڈھلتا؟

کرونا وائرس کا آنا خدائے واحد کے ماننے والوں کے لیے توبہ، رجوع الی اللہ اور ایمان کی تقویت کا سبب بننا چاہیے تھا۔ ابلاغ کے عالمی ادارے جس طرح اس مسئلے کی تفصیل پیش کررہے تھے وہ ان میں ایمان کے بجائے موت کے خوف کی وجہ بن رہا تھا۔ اگر علمِ غیر نافع کی تمیز نہ ہو اور انسان اپنی علمی ضروریات میڈیا سے پوری کرے تو جو شعور مرتب ہوگا اسے دین کے تناظر میں جہل کہیں گے۔ خوف، گھبراہٹ، نا اُمیدی اور مایوسی اس پر چھا جائیں گے۔ اسے یہ محسوس ہوگا کہ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ وائرس ہے اور زندگی کا اصل مقصد اس سے بچنا اور بچانا ہے۔

ربّ کریم ہمارے عقیدے کی اصلاح فرمادے اور ہمیں یقینِ صادق اور ایمانِ کامل عطا فرمائے۔ ربّ کریم ہمارے ایمان اور عقیدے کو ہمارے شعور کا حال اور نفسیات کی اساس بنادے۔ ربّ کریم ہماری نفسیاتی صحت کو اس قابل بنائے کہ وہ عقیدے سے وفاداری کے تقاضے بحسن وخوبی نبھا سکے۔

ملی مجلس شرعی

چیف جسٹس آف پاکستان کے قادیانیوں سے متعلق فیصلے پر

ملی مجلس شرعی کے تمام مکاتبِ فکر کے علماء کرام کا متفقہ تبصرہ اور تجاویز

ملی مجلس شرعی، جو تمام دینی مکاتب فکر کے علماء کا مشترکہ علمی فورم ہے اور ۲۰۰۷ء سے کام کررہا ہے، اس کے علماء کرام کا ایک اجلاس ۵ مارچ ۲۰۲۴ء کو جامعہ عثمانیہ/ جامع آسٹریلیا لاہور میں ہوا۔ علماء کرام نے چیف جسٹس صاحب کے قادیانیوں سے متعلق فیصلے پر شق وار غور کیا اور مندرجہ ذیل رائے دی جسے سپریم کورٹ کو بھجوانے کا فیصلہ کیا گیا:

۱۔ پیراگراف 6

اپنے فیصلے کے پیراگراف 6 میں چیف جسٹس صاحب نے قرآن حکیم کی آیت ﴿لَآ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ﴾ [البقرہ ۲:۲۵۶] کا حوالہ دیا ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں جبکہ زیر بحث موضوع سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ کیس یہ ہے ہی نہیں کہ مسلمان قادیانیوں کو زبردستی مسلمان کررہے ہیں، نہ قادیانیوں نے یہ شکایت کی ہے کہ مسلمان انہیں زبردستی مسلمان بنا رہے ہیں لہٰذا چیف جسٹس صاحب کا یہاں اس آیت کا حوالہ دینا غیر متعلق ہے۔

۲۔ پیراگراف 7

یہاں چیف جسٹس صاحب نے قرآن حکیم کی دو آیتیں پیش کی ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذمہ داری دین پہنچا دینے کی تھی نہ کہ لوگوں کو زبردستی مسلمان کرنے کی۔ چیف جسٹس صاحب کا یہ حوالہ بھی زیر بحث کیس سے غیر متعلق ہے اور خلط مبحث کا باعث ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیس زیر بحث میں زبردستی مسلمان کرنے کی شکایت نہ تو قادیانیوں نے کی ہے اور نہ مسلمان اس کے مدعی ہیں اور نہ اس پر عامل ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی کبھی کسی کو زبردستی مسلمان نہیں کیا۔ پھر پہنچا دینے کا مفہوم بھی چیف جسٹس صاحب غلط لے رہے ہیں۔ بلاشبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولیں ذمہ داری دین پہنچا دینے ہی کی تھی لیکن قرآنی تعلیمات اس پر

شاہد ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اس کا گواہ ہے کہ آپ نے اسلامی معاشرہ بھی قائم کیا اور اسلامی ریاست بھی اور ریاست کی قوت سے اسلامی احکام پر عمل بھی کرایا۔ لہٰذا ''پہنچا دینے'' کا جو مفہوم چیف جسٹس صاحب لے رہے ہیں وہ صحیح نہیں ہے۔

چیف جسٹس صاحب نے اس پیراگراف میں یہ بھی کہا ہے کہ دین میں جبر تصورِ آخرت کے بھی منافی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب اسلام دین میں جبر کا قائل ہی نہیں، نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی اس پر عمل کیا، نہ اس کا حکم دیا، نہ مسلمان اس کے قائل ہیں، نہ قادیانیوں نے یہ شکایت کی ہے کہ مسلمان انہیں زبردستی مسلمان بنا رہے ہیں تو چیف جسٹس صاحب کو یہ مقدمہ پیش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ لہٰذا اس آیت کا ذکر بھی یہاں بے محل اور غیر متعلق ہے۔

۳۔ پیراگراف 8

اس میں چیف جسٹس صاحب کہتے ہیں کہ قرآن غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور اس کے لیے انہوں نے قرآن حکیم کی دو آیات نقل کی ہیں۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ اس کیس میں آیات پر تدبر کرنے کی بجائے مدعی کی خواہش یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ ملزمان کو توہینِ قرآن اور گستاخیٔ رسول کا مرتکب قرار دے۔

۔ اس کو اردو محاورے میں کہتے ہیں ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ جناب! قرآنِ حکیم میں تدبر کرنے کا اس بات سے کیا تعلق ہے کہ کسی مرتد (و اولادِ مرتد) اور غیر مسلم کو قرآن کی غلط تشریح کرنے اور اس کی مسلمانوں میں تشہیر کرنے سے روکنے کی کوشش کی جائے جبکہ ریاست قرآن کی اس تشریح کو غلط اور مسلمانوں کے لیے مضر اور اشتعال انگیز قرار دے کر پہلے ہی اس پر پابندی لگا چکی ہے۔

۔ پھر چیف جسٹس صاحب نے یہ نہیں سوچا کہ قرآن پر غور و تدبر کا مقصود کیا ہے؟ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن پڑھنے اور اس پر غور و تدبر کرنے کا حکم اسی لیے دیا ہے کہ اس پر عمل کیا جا سکے۔ اور تعلیم ہی اگر غلط ہو تو اس پر عمل بھی غلط ہوگا، لہٰذا اگر کسی مسلمان نے کسی غیر مسلم کو قرآن کی غلط تشریح کرنے پر ٹوکا ہے یا ریاست نے اسے اس سے روکا ہے تو ٹھیک کیا ہے۔ یہ قرآنِ حکیم پر صحیح تدبر کا صحیح نتیجہ ہے لیکن چیف جسٹس صاحب اسے خلاف تدبر قرار دے رہے ہیں۔

پھر اس پیراگراف میں چیف جسٹس صاحب نے قرآن حکیم کی اس آیت کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ قرآن ہم نے نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔ سوال یہ ہے کہ اس بات کا زیر بحث کیس سے کیا تعلق ہے؟ یا یہ مدعی کے خلاف اور مدعاعلیہم کے حق میں کیسے جاتی ہے؟ اس آیت کا تقاضا تو یہ ہے کہ مسلمان اور ان کی ریاست متنِ قرآن کی حفاظت کریں اور قرآن کی اس تشریح کی حفاظت کریں جو مسلمانوں کی ۱۴۵۰ سالہ جمہور اہلِ علم اور جمہور امت کی روایت ہے۔ اس لحاظ سے اگر کوئی اس آیت کو پیش کر کے اس کی تشریح کرے تو یہ مدعی کے حق میں جاتی ہے نہ کہ مدعاعلیہم کے حق میں، جو مسلمانوں کی قرآن کی متفق علیہ تعبیر کی مخالفت کرتے ہیں اور انہوں نے اس پر ایک نیا مذہب کھڑا کر لیا ہے۔

۴۔ چیف جسٹس صاحب کو مشورہ

i۔ مندرجہ بالا تصریحات سے ظاہر ہے کہ چیف جسٹس صاحب نے اپنے فیصلے میں جتنی قرآنی آیات کا بھی حوالہ دیا ہے وہ اس موضوع سے غیر متعلق ہیں جس کی وجہ سے خلط مبحث پیدا ہوا ہے۔ لہٰذا ہم انہیں مشورہ دیتے ہیں کہ انہیں خود محسوس کرنا چاہیے کہ وہ قرآنی علوم کے ماہر نہیں ہیں لہٰذا انہیں چاہیے کہ قرآن حکیم سے براہ راست خود استفادہ کرنے کی بجائے ان اہلِ علم سے مشورہ لے لیا کریں جنہوں نے ساری عمر قرآن حکیم کو سمجھنے سمجھانے اور سیکھنے سکھانے میں گزاری ہے جیسا کہ خود انہوں نے 26 فروری 2024ء والے فیصلے میں کیا ہے کہ بعض دینی اداروں کو اس سلسلے میں معاونت کے لیے کہا ہے۔ یہ کام انہیں 6 فروری 2024ء کا فیصلہ کرنے سے پہلے کرنا چاہیے تھا۔

ii۔ اہل علم سے مشورہ لینے میں یہ احتیاط ضروری ہے کہ مشورہ ان سے لیا جائے جو امت کی 1450 سالہ علمی روایت کے امین ہیں اور 'جمہور علماء' اور 'جمہور امت' کہلاتے ہیں نہ کہ شاذ رائے رکھنے والے کسی ایسے متجدد سے جو مغرب کی الحادی فکر و تہذیب سے مرعوب ہو کر قرآن و سنت کی تشریح ایسے کرتا ہو جو مغربی فکر و تہذیب اور اس کے علمبرداروں کے مفادات کے مطابق ہو جیسے جاوید احمد غامدی صاحب جنہیں سارے پاکستان کے علماء گمراہ قرار دے چکے ہیں اور جن کے ادارے المورد کو چیف جسٹس صاحب نے دینی امور میں مشاورت کے لیے بلایا

ہے۔ اگر وہ ان جیسے لوگوں سے مشاورت کریں گے تو پاکستان کی ملت اسلامیہ کبھی ان کے فیصلوں کو قبول نہیں کرے گی لہٰذا اُنہیں المورد کو مشاورت کے لیے نہیں بلانا چاہیے تھا۔

۵۔پیراگراف 8

چیف جسٹس صاحب نے یہاں فرمایا ہے کہ آئین میں دیئے گئے بنیادی حقوق غیر مسلموں کو اپنے تعلیمی اداروں میں اپنے مذہب کی تعلیم وتلقین کی اجازت دیتے ہیں۔

i۔ یہاں پہلی بات تو نوٹ کرنے کی یہ ہے کہ آئین یہ اجازت غیر مشروط طور پر نہیں دیتا بلکہ اسے قانون کی مطابقت سے مشروط کرتا ہے۔اب یہ دیکھیے کہ آئین پاکستان قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیتا ہے اور قانون ان کو اسلامی شعائر اور مصطلحات کے استعمال سے روکتا ہے جیسے امیر المومنین،صحابہ کرام،اہل بیت،مسجد،اذان وغیرہ۔

ii۔ دوسرے یہ کہ قادیانی حضرات اپنے مذہب کو ساری دنیا میں،اور پاکستان میں صحیح اسلام اور صحیح مسلمان کے طور پر متعارف کراتے ہیں اور اس کی تبلیغ کرتے ہیں۔اس کے لیے وہ اپنا لٹریچر وسیع پیمانے پر طبع اور تقسیم کرتے ہیں اور اس مقصد سے سوشل، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ دوسرے مسلمانوں کو (یعنی عامۃ المسلمین) کو وہ کافر اور جہنمی قرار دیتے ہیں۔ان حالات میں پاکستانی مسلمان اور علماء کرام اس کو صحیح تسلیم نہیں کرسکتے کہ قادیانیوں کو بنیادی انسانی حقوق کے کور (Cover) کے تحت غیر اسلامی مواد کی طباعت اور تقسیم کی اجازت دی جائے،اپنے اداروں میں بھی اور باہر بھی۔

۶۔دفعہ 298C

چیف جسٹس صاحب کو یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے تھا کہ حکومت پنجاب کے ادارے 'قرآن بورڈ' نے اس قرآنی تفسیر 'تفسیر صغیر' پر 2016ء سے اسے غیر قانونی قرار دے کر اس پر پابندی لگا رکھی ہے کیونکہ اس میں قرآن حکیم کی تشریح قادیانی نقطۂ نظر سے اس طرح کی گئی ہے کہ اس کی طباعت اور تقسیم عام مسلمانوں کے لیے مضر اور اشتعال کا سبب بن سکتی ہے لیکن اس کے باوجود قادیانی نہ صرف اسے پاکستان میں چھپوار ہے ہیں اور تقسیم کر رہے ہیں (بلکہ ساری دنیا میں اسے صحیح اسلامی تفسیر کہہ کر پھیلا رہے ہیں)۔ملزم اس کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنے گروہ کو

اصل مسلمان ثابت کرنے کے لیے اس کتاب کی ترویج و تقسیم میں مصروف تھا جو 298C کے تحت جرم بنتا ہے۔لطف کی بات یہ کہ ملزم نے ٹرائل کورٹ اور ہائی کورٹ میں کسی جگہ اس دفعہ کے خارج کیے جانے کا مطالبہ کیا ہی نہیں لیکن فاضل چیف جسٹس نے ازخود ملزمان کو اس دفعہ سے خارج کر دیا ہے۔

۷۔ دفعہ 295B

چیف جسٹس صاحب فرماتے ہیں کہ ملزم کے خلاف 295B کا الزام ثابت نہیں ہوتا اور اسے مقدمے سے خارج کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ جب 295B میں Defilement کا لفظ موجود ہے جس کے معنی آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق یہ ہیں:

To make something dirty or no longer pure

اور اس کے مترادفات (Synonyms) ہیں : Spoil, debase, pollute, degrade, dishonour جبکہ یہی بات تو یہاں زیر بحث ہے کہ ملزمان نے قرآن کے متن، ترجمہ اور تفسیر کی ایسی طباعت واشاعت کی ہے کہ جس میں قرآنی مفاہیم میں تحریف اور زیادتی کی گئی ہے تو اس پر 295B کا اطلاق کیوں نہیں ہوتا اور چیف جسٹس صاحب نے کیونکر اس پر 295B کے اطلاق سے انکار کیا ہے؟

۸۔ جس مواد پر حکومت پابندی لگا دے اس کی طباعت واشاعت دہشت گردی کے ضمن میں آتی ہے (دیکھیے دہشت گردی ایکٹ 1997ء کی دفعہ 8 اور 11W) لیکن فاضل چیف جسٹس صاحب اس پر غور ہی نہیں فرما سکے اور ملزمان کو بری کر دیا۔

۹۔ چیف جسٹس صاحب فرماتے ہیں کہ اس مقدمے پر کریمنل امینڈمنٹ ایکٹ 1932ء لاگو ہوتا ہے جس کے تحت اس جرم کی زیادہ سے زیادہ سزا 6 ماہ قید ہے (جبکہ ملزم اس سے زیادہ قید کاٹ چکا ہے لہٰذا اس کی ضمانت قبول کی جانی چاہیے تھی) جبکہ مذکورہ ایکٹ 64 سال پہلے پریس اینڈ پبلی کیشن ایکٹ 1960ء کے ذریعے ختم کر دیا گیا تھا۔ جس کے ثبوت میں اعلیٰ عدلیہ کے فیصلے دیکھے جا سکتے ہیں۔ جبکہ اس کیس پر اطلاق درحقیقت ''پنجاب ہولی قرآن (پرنٹنگ اینڈ ریکارڈنگ ایکٹ 2011ء (دفعہ 7 اور 9) کا ہوتا ہے جس کے تحت اس کی سزا عمر

قید اور کم از کم سزا تین سال ہے۔ چیف جسٹس صاحب نے ایسا کیوں کیا ہے؟ اس کا جواب تو وہی دے سکتے ہیں۔

۱۰۔ پیراگراف 9

چیف جسٹس صاحب اس میں فرماتے ہیں کہ ہر شہری کو مذہبی آزادی کا بنیادی حق حاصل ہے مگر بنیادی حقوق کی دفعہ 4 میں یہ آزادی مشروط ہے قانون کی مطابقت سے۔ پھر آئین کے آرٹیکل 260B کے مطابق قادیانی کوئی مذہب نہیں (ہندوؤں اور عیسائیوں کی طرح) بلکہ چند افراد کا ایک گروپ ہے جو اسلام کے حساس عقائد میں تحریف کرتا ہے۔ یہ بات قومی اسمبلی کی ان ابحاث میں بالکل واضح ہے جو 260B بناتے وقت قومی اسمبلی میں ہوئیں۔

۱۱۔ پیراگراف 10

چیف جسٹس صاحب فرماتے ہیں کہ اگر متعلقہ ادارے قرآن، آئین اور قانون کو دیکھ لیتے تو FIR درج ہی نہ ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ آئین کا آرٹیکل 4 کہتا ہے کہ ہر فرد کو آزادی حاصل ہے مگر قانون کے مطابق۔ اور قانون کہتا ہے کہ قادیانی غیر مسلم ہیں اور وہ مسلمانوں کے شعائر اور اصطلاحات استعمال نہیں کر سکتے۔ تحریف شدہ ترجمہ قرآن بھی، خلافِ قانون اور قابلِ سزا ہے قرآن بورڈ نے ہولی قرآن ایکٹ 2011ء کے تحت اس پر پابندی لگائی ہے تو عدالت کیسے کہہ سکتی ہے کہ FIR درج ہی نہیں ہونی چاہیے تھی۔

۱۲۔ پیراگراف 16

چیف جسٹس صاحب اس امر پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ مذہبی جرائم کی روک تھام ریاست کا کام ہے نہ کہ کسی اکیلے آدمی کا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آئین کی رو سے پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے جس میں کوئی قانون خلاف اسلام نہیں بنایا جا سکتا اور اگر بن جائے تو ہر مسلمان کو حق ہے کہ وہ اسے اس بنیاد پر چیلنج کر کے کہ یہ قرآن وسنت کے خلاف ہے لہٰذا یہ کہنا صحیح نہیں کہ مذہب کے خلاف قوانین کو کوئی فرد چیلنج نہیں کر سکتا۔ یہاں تو ریاست کی یہ حالت ہے کہ مدعی نے 2019ء میں ریاست سے مطالبہ کرنا شروع کیا کہ ملزمان توہین قرآن کے

مرتکب ہو رہے ہیں لیکن پوری کوشش اور بھرپور فالو اَپ کے بعد کہیں 2022ء میں جا کر ملزمان کے خلاف FIR کاٹی گئی۔

۱۳۔ ایک ملزم چیف جسٹس صاحب کے پاس ضمانت کرانے آیا تھا باقی ملزمان مفرور تھے۔ چیف جسٹس صاحب نے انہیں بغیر مانگے، ان کی درخواست ضمانت کو اپیل میں بدلا اور پھر اسے قبول کرنے کا اعلان کر دیا یعنی وہ سب جرم سے بری قرار دیئے گئے۔ قادیانیوں سے یہ آؤٹ آف باکس مہربانی کی وجہ چیف جسٹس صاحب ہی بتا سکتے ہیں اور پھر ان کا مشہور زمانہ رویہ کہ وکیلوں کو بولنے نہ دو، ڈانٹ ڈپٹ کر کے انہیں توہین عدالت کی دھمکی دو، خود بولتے رہو اور خود ہی فیصلہ کر دو۔ چیف جسٹس صاحب کا Tenure بہت تھوڑا ہے لیکن اپنے اس رویے کی وجہ سے وہ مدتوں یاد رکھے جائیں گے، جیسا کہ لوگ آج بھی اس چیف جسٹس کو یاد کرتے ہیں جس کے پاس ایک مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر قوانین میں تبدیلی کرنے کی اجازت لینے گیا اور سپریم کورٹ نے اسے آئین تبدیل کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ ماشاءاللہ!

۱۴۔ آئین وقانون میں تبدیلی کی ضرورت

i۔ ہم سمجھتے ہیں کہ علماء کرام اور عوام نے تحریک چلا کر 1974ء میں پارلیمنٹ سے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دلوا دیا۔ پھر تجربے نے ثابت کیا کہ قادیانیوں نے اس فیصلے کو قبول نہیں کیا اور وہ مسلسل خود کو اصلی مسلمان ظاہر کرتے اور مسلمانوں کو قادیانی بنانے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ اس بناء پر علماء کے مطالبے پر جنرل ضیاء الحق کو امتناع قادیانیت آرڈیننس 1984ء میں پاس کرنا پڑا اور 295B میں قادیانیوں کو مسلمانوں کی بعض اصطلاحات اور شعائر کا نام لے کر ذکر کرنا پڑا کہ وہ انہیں استعمال نہیں کر سکتے۔ اس کے باوجود ہمارا تجربہ یہ ہے کہ قادیانی بدستور التباس پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لہٰذا ایسے مزید اقدامات کی ضرورت ہے۔ کچھ چیزوں کے نام لے کر ان کا ذکر کرنے کی ضرورت ہے کہ قادیانیوں کو ان کے استعمال سے روک دیا جائے جن کی فہرست ہم یہاں دے رہے ہیں۔

ii۔ آئین میں تبدیلی کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ چیف جسٹس صاحب اور ان کی طرح کے کئی لوگ سمجھتے ہیں کہ قادیانیوں کے خلاف جو قانون سازی کی گئی ہے وہ اقوام متحدہ کے

بنیادی حقوق کے چارٹر اور آئین پاکستان میں مذکور بنیادی حقوق کے خلاف ہے۔اس بات سے اگر صرفِ نظر بھی کر لیا جائے کہ آئین پاکستان میں دیئے گئے بنیادی حقوق مغربی ممالک اور اقوام متحدہ کے بنیادی حقوق سے لیے گئے ہیں اور ان میں سے کئی قرآن وسنت کے خلاف ہیں، ہم کہتے ہیں کہ اس التباس سے بچنے کی موزوں صورت یہ ہے کہ آئین کے متعلقہ بنیادی حقوق میں جہاں شہری آزادیوں کا ذکر ہے وہاں اسے قادیانیوں سے متعلق قوانین سے مشروط کر دیا جائے۔اس کی وجہ یہ ہے، اور ہم کہتے ہیں کہ یہ وجہ بہت اہم ہے اور وہ یہ ہے کہ قادیانیوں کا مسئلہ عام غیر مسلموں (ہندوؤں اور عیسائیوں) جیسا نہیں ہے بلکہ وہ مرتد (اور اولادِ مرتد) ہیں اور انہوں نے اسلام ترک کیا ہے لہٰذا ان پر ایسی پابندیوں کا اطلاق تقاضائے انصاف ہے جن سے وہ خود کو مسلمان نہ ظاہر کر سکیں اور انہیں مسلمانوں کو قادیانی بنانے کی اجازت نہ ہو۔

اس لیے ہم چیف جسٹس صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ حکومت کو آئین میں مذکورہ آئینی تبدیلی کے علاوہ 295B میں مندرجہ ذیل امور کو قانون میں شامل کرنے کی تجویز دیں:

۱۔ ''احمدیوں'' کو 'قادیانی غیر مسلم' اور 'لاہوری غیر مسلم' کہا جائے اور انہیں 'احمدی' نہ کہا جائے کیونکہ احمدی اور محمدی تو عام مسلمان ہیں۔

۲۔ شناختی کارڈ میں مذہب کا خانہ رکھا جائے اور اس میں انہیں 'قادیانی غیر مسلم' اور 'لاہوری غیر مسلم' لکھا جائے۔

۳۔قادیانی اور لاہوری غیر مسلموں کو مسلمانوں جیسے نام رکھنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

۴۔ وہ قرآن کو اپنی مذہبی کتاب نہیں کہہ سکتے اور نہ اس کی طباعت واشاعت وتدریس کر سکتے ہیں کیونکہ یہ مسلمانوں کی مقدس مذہبی کتاب ہے نہ کہ ان کی۔یہی معاملہ کتبِ حدیث کے ساتھ بھی ہونا چاہیے۔

۵۔ ان کے مرد وخواتین کا لباس اور ان کی وضع قطع (داڑھی ٹوپی وغیرہ) مخصوص ہونی چاہیے اور عام مسلمانوں جیسی نہیں ہونی چاہیے جیسا کہ عہد صحابہ میں تھا اور حضرت عمرؓ نے اس کا حکم دیا تھا۔

۶۔ وہ اسلام کے کسی رکن مثلاً صلاۃ، صوم، زکوٰۃ، حج اور جمعہ، عیدین، قربانی کو اپنی

عبادت کے طور پر اختیار نہیں کر سکتے۔

۷۔ وہ اسلام کی اصطلاحات، شعائر، اسماء اور کسی بھی ایسے امر/رسم کو اختیار اور استعمال نہیں کر سکتے جس سے وہ یہ التباس پیدا کر سکیں کہ وہ مسلمان ہیں اور نہ انہیں کسی بھی شکل میں خود کو مسلمان کہلانے کی اجازت ہو۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا کہ وہ عام کفار یعنی ہندوؤں، عیسائیوں کی طرح نہیں ہیں بلکہ وہ مرتد ہیں اور ترکِ اسلام کے مجرم ہیں لہٰذا ان کا مسلمانوں سے اور ان کے شعائر، مقدسات، عبادات، اصطلاحات، رسوم ورواج سے الگ اور متمیز ہونا ضروری ہے تاکہ ان کی الگ شناخت ممکن ہو سکے۔

اسمائے گرامی شرکاءِ مجلس

۱۔ مولانا زاہد الراشدی (شیخ الحدیث جامعہ نصرۃ العلوم وڈائریکٹر شریعہ اکیڈمی، گوجرانوالہ)

۲۔ مولانا مفتی ڈاکٹر محمد کریم خان (چیئرمین وفاق المدارس الرضویہ، لاہور)

۳۔ مولانا عبدالمالک (صدر وفاق رابطۃ المدارس، لاہور)

۴۔ مولانا عبدالرؤف ملک (سرپرست جامعہ عثمانیہ وآسٹریلیا مسجد، لاہور)

۵۔ مولانا حافظ عبدالغفار روپڑی (مہتمم جامعہ اہلحدیث، چوک دالگراں، لاہور)

۶۔ مولانا محمد الیاس چنیوٹی (امیر انٹرنیشنل ختم نبوت موومنٹ، پاکستان)

۷۔ مولانا عبدالرؤف فاروقی (مہتمم جامعہ اسلامیہ ومرکز تحقیق اسلامی، کامونکی)

۸۔ ڈاکٹر فرید احمد پراچہ (نائب امیر جماعت اسلامی، پاکستان)

۹۔ مولانا سردار محمد خان لغاری (ناظم اعلیٰ متحدہ علماء کونسل، لاہور)

۱۰۔ حافظ ڈاکٹر حسن مدنی (مہتمم جامعہ رحمانیہ و پروفیسر پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

۱۱۔ مولانا حافظ محمد عمران طحاوی (نائب ناظم اعلیٰ ملی مجلس شرعی، لاہور)

۱۲۔ مولانا عبداللہ مدنی (ناظم تعلیمات جامعہ فتحیہ ومسئول وفاق المدارس العربیہ لاہور)

۱۳۔ حافظ ڈاکٹر محمد سلیم (مہتمم جامعہ عثمانیہ وآسٹریلیا مسجد، لاہور)

۱۴۔ مولانا ڈاکٹر محمد امین (سابق پروفیسر علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

اسلام اور مغرب

سرفراز احمد

کیا سائنسی ترقی ناگزیر ہے؟
اور کیا اس سے مرعوبیت شرعاً جائز ہے؟

سائنس ایک ایسا ٹول ہے جس کے ذریعے ایک خاص نظامِ زندگی برپا کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں لیا جا سکتا۔ سائنس کے الحادی و غیر الحادی اور اسلامی و غیر اسلامی ہونے کی بحث اہم نہیں ہے، اہم یہ ہے کہ وہ نظامِ زندگی جو سائنس برپا کرتی ہے وہ شرعاً مطلوب ہے یا نہیں؟ اس میں دو پوزیشنز پر گفتگو کے علاوہ جو بات بھی کی جاتی ہے وہ غیر متعلقہ یا بہت ضمنی ہوتی ہے۔ یا تو آپ یہ کہیں کہ سائنس جو نظامِ زندگی برپا کرتی ہے وہ مطلوب ہے یا یہ کہیں کہ سائنس کا ایسا اختیاری استعمال ممکن ہے جس سے نظامِ زندگی سے متعلق ''شرعاً کم از کم مطلوب'' کے اندر اس کو فنکشنلائز رکھا جا سکتا ہے۔ اول الذکر بات عموماً اسلامسٹ نہیں کرتے، ان کے لیے دوسری بات زیادہ کنفیوژن کا باعث ہے۔ اور اس کنفیوژن کو دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پچھلے دو ڈھائی سو سال کی تہذیبی تبدیلیوں اور اس دوران معاشرے پر کمزور پڑتی مذہبی گرفت میں اہلِ مذہب کی کوشش کے باوجود اس خواہش (کہ سائنس سے تعامل معاشرتی طور پر شریعت کو کم از کم مطلوب میں رکاوٹ نہ بنے) کو پورا کر سکنے پر قادر نہ ہونا ہے۔

اس بحث میں کنفیوژن لاشعوری طور پر اس سوال کو ذہن میں ساتھ لے کر چلنے کی وجہ سے آتی ہے کہ ''تو ہم مغرب کا مقابلہ کیسے کریں گے؟'' دراصل یہ سوال حکمتِ عملی سے متعلق ہے اس کو بحث کی بنیادیں سمجھتے ہوئے کم از کم اپنے ذہن سے الگ ہی رکھنا چاہیے۔ ہمیں نہیں معلوم اللہ اپنی تکوینی اسکیم کے تحت کس طرح مغرب کو مغلوب کریں گے۔ ہماری اخلاقی مضبوطی و دعوتی مساعی مغرب کو متاثر کر کے اسے وہ نظامِ زندگی ترک کرنے پر مجبور کرے گی جو سائنس کا برپا کردہ ہے یا یہ سیلف ڈسٹرکشن کے اصول کے تحت خود ہی تہذیبی سطح پر رجوع اختیار کرے گا؟ یا یہ سلسلہ تا قیامت چلے گا اور اسی کشمکش میں ہمیں جینا پڑے گا۔ بہر حال بنیادی بحث کو سمجھنے کے لیے اس سوال کو ذہن میں متوازی چلانا قطعاً ضروری نہیں۔ بنیادی سوال یہ

ہے کہ دورِ مغلوبیت میں سائنس سے برتاؤ اصولی طور پر کیسے کیا جائے؟ یہ بات یاد رہے کہ یہ عین ممکن ہے کہ غلبہ و مغلوبیت دونوں ادوار میں سائنس کا اصولی مقام ذہن میں واضح ہونے کے باجود اس سے برتاؤ کی حکمتِ عملی مختلف رہے۔

کچھ چیزوں میں ربط و تعلق کو سمجھے بغیر سائنس سے برتاؤ کی حکمتِ عملی وضع کرنا حماقت ہے۔ مذہب یا مذہبی معاشرہ کے تمام تصورات (خیر، ذات، علم، اخلاق وغیرہا) میں ایک خاص ربط و ہم آہنگی ہوتی ہے۔ یہی ربط سرمایہ داری کے اپنے تصورات میں بھی ہوتا ہے۔ یہ دونوں بطور پیکیج قبول کرنے سے ہی اپنے تہذیبی ثمرات گیرینٹی کرتے ہیں۔ ان میں مَن پسند سلیکشن کے خواب دیکھنا یا خواہش رکھنا بیمار و کنفیوزڈ (Confused) تہذیب کی علامت ہے۔ کوئی ایسی تہذیب اختیار کرنا جو تبدیلی کے عمل سے گزرنے کی وجہ سے جس کے تصورات و اقدار اپنے نہ ہونے کی وجہ سے ربط و ہم آہنگی سے محروم ہوں اور وہ مختلف تہذیبوں سے کشید کردہ ہوں اس کی بدقسمتی یہ ہوتی ہے کہ وہ بہت جلد تحلیل ہو کر غالب تہذیب میں ضم ہو جاتی ہے اور بالآخر اسی کے اقدار و تصورات میں بھی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے لیکن اپنی تہذیب کی قربانی کی قیمت پر۔

آزادی و ترقی جوہری اعتبار سے اپنے اندر بلا کا ربط و ہم آہنگی رکھنے والی مغرب کی دو بنیادی قدریں ہیں۔ (سائنسی) ترقی آزادی کے بغیر ممکن نہیں اور آزادی کی ٹھوس شکل سرمایہ ہے۔ سرمایہ خود میں مستقل اضافے کے عمل سے الگ ہو جائے تو سرمایہ نہیں رہتا لہٰذا اس عمل کو جاری رکھنے کے لیے ایسے نظمِ زندگی کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے جس کے حریص فرد، معاشرہ اور ریاست سرمائے کے اس واحد استعمال پر کہ یہ خود میں مستقل اضافے کے لیے ہی ہے، ایمان لاتے ہوں اور ایسے نظمِ زندگی کی تشکیلِ نو کسی بھی مذہبی معاشرے کی رحلت پر ہی منتج ہوتی ہے۔ سائنسی ترقی کے نتیجے میں ہر طرح کے معاشروں کی مذہبیت کس طرح تحلیل ہوئی ہے اس کے لیے یورپ کے صنعتی انقلاب کا مطالعہ کرتے ہوئے ان سوالوں کو ذہن میں بار بار لانا ضروری ہے کہ آخر ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس انقلاب کے نتیجے میں کسی خطے کی مذہبیت تحلیل نہ ہوئی ہو؟

اس سادہ سی تمہید کو بارہا عرض کرنے کے باوجود سائنسی ترقی سے مرعوب معاصر مذہبی

ذہن کا اصل مسئلہ سرمایہ داری اور مذہب کے دائروں کے اوورلیپڈ (Over Lapped) ایریا کی موجودگی پر اصرار ہے۔ اس سادہ سی تمہید پر اب آپ کی جائز تنقید یہی ہوسکتی ہے کہ آپ کسی بھی مذہب کے صدیوں کے تعامل اور بنیادی مذہبی تعلیمات میں اس مذہب کے مقاصد ثابت کریں کہ وہ بنیادی طور پر آزادی اور ترقی کا حصول ہی تھا یا کبھی رہا ہے اور اس سے پہلے مغرب کے ان دونوں عقائد (آزادی و ترقی) کا مطالعہ لازمی ہے۔ اگر ایسا ہوجاتا ہے تو اوپر ذکر کردہ تمہید خود ہی زمین بوس ہوجائے گی۔

سائنس کی افادیت کو عموماً 'اس سے ہمارے فلاں فلاں مسائل حل ہوئے ہیں' کے تناظر میں دیکھنے والے اس سوال سے دانستہ اغماض برت جاتے ہیں کہ کیا وہی مسائل انسانی زندگی میں اسی سائنس نے نہیں پیدا کیے؟ مسائل پیدا کرکے اس کے حل پیش کرنے تک کے تہذیبی عمل کے دورانئے کے دوران اس تجربے کہ یہ سائنس ہمارے مسائل حل کررہی ہے، میں بطور ایندھن وہی لوگ استعمال ہوئے ہیں جو اس تہذیبی دورانیے کی الیٹ (Elite) قرار پائے ہیں۔ اس ریشنیلیٹی (Rationality) کے بے بنیاد زعم کا کیا فائدہ جو آپ کو ایک ناکام تہذیبی تجربے کا ایندھن بننے سے نہ بچاسکی؟ یہ جو مغرب ہمیں کبھی سادہ طرزِ زندگی بطور واحد حل کی دعوت دے بیٹھتا ہے اس میں نہ اس کی تحقیق کوئی تحقیق ہے اور نہ پیش کردہ حل قابلِ فخر۔ تحقیق اس لیے کہ یہ کوئی تحقیق نہیں اور یہ کوئی مغرب کا دریافت کردہ حل نہیں بلکہ کئی روایتی تہذیبوں کا تاریخی عمل رہا ہے۔ اور قابلِ فخر اس لیے نہیں کہ ایک ناکام تہذیبی تجربے میں ڈھائی تین صدیاں برباد کرنے کے بعد مغرب کو تہذیبوں کی عدالت میں کسی حل پیش کرنے والے نجات دہندہ کی بجائے بطور مجرم پیش ہونا چاہیے۔ اس تہذیبی قضیے میں سب سے زیادہ قابلِ رحم وہ انسان ہے جس کی شناخت تو مذہبی ہے لیکن اس خاص تہذیبی تجربے [کہ سائنس مسائل پیدا کیے بغیر حل پیش کرے گی] کے ناکامی پر منتج ہوتے آخری مراحل میں بھی سائنس سے مرعوبیت کی وہ سطح پائی جاتی ہے کہ جو اس تہذیبی تجربے کے دورانیے کے آغاز میں اس تہذیب کے اکابرین [سائنس دانوں] میں پائی جاتی تھی۔

لیکن اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ سائنس تو موجود ہے اور مسلسل تعامل رکھنے کا جبر بھی، تو

اب ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی جدید سائنسی ایجاد سے دین کے کام میں تعاون لینے کے لئے اسے انسٹرومنٹلائز (Instrumentalize)(یعنی محض بطور آلہ استعمال) کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔اس لیے کہ اگر آپ نے اسے آئیڈیلائز (Idealize) کیا تو اب کام دین کا نہیں ہوگا بلکہ وہ ٹول(Tool) ہی مقصود بالذات ہوجائے گا۔ٹول کومقصود بالذات میں ''معاونِ محض'' کے طور پر برتنا اور خودٹول کو مقصود بالذات سمجھنا دو متضا د رویے ہیں۔

اگر آپ مغرب سے یہ کہیں کہ ہمارے دین میں ایسے احکام مثلاً ''ناپ تول میں کمی نہ کرنا'' یا ''سچ بولنا'' وغیرہ بھی ہیں جن پر عمل کے نتیجے میں انسانوں کے معاشی کام کے عمل کی ایفیشینسی (Efficiency) بڑھ جائے گی لہٰذا آپ اپنے ہاں ہمارے دین کے اس جز کی تعلیم کی اجازت دیں تو مغرب آپ کے دین کے اس حکم کو انسٹرومنٹلائز کرے گا اور دامے درمے سخنے اس جز پر عمل کے لئے تیار ہوجائے گا کیونکہ وہ اس سے اپنے مقصود بالذات یعنی سرمایہ دارانہ عمل کومہمیز دے گا۔لیکن اگر آپ مغرب سے یہ کہیں کہ یہی جز جس دین کا حکم ہے آپ اپنے ہاں اسے الخیر تصور کرتے ہوئے مکمل نافذ کردیں تو وہ اس لیے انکار کردے گا کہ اس سے مقصود بالذات یعنی سرمایہ دارانہ عمل سست ہوکر بالآخر ختم ہوجائے گا۔تو ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم کسی سائنسی ایجاد وغیرہ کو دینی کام میں انسٹرومنٹلائز کی بجائے آئیڈیلائز کررہے ہیں جبکہ مغرب آپ کے دین کو آئیڈیالائیز کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا؟

مغرب اور اہلِ دین کے آپس میں ایک دوسرے سے تعامل کے متعلق کے بالکل ہی مختلف رویے یا تو اس وجہ سے ہوسکتے ہیں کہ مغرب اپنے مقصد کے لحاظ سے آپ سے زیادہ مخلص ہے یا زیادہ کلیئر۔میری رائے میں دوسری بات زیادہ صحیح ہے کہ اہلِ دین میں بہرحال اخلاص کی کمی نہیں۔اور ویسے بھی جب آپ جدید سائنس کے تہذیبی جبر میں زندہ ہیں تو بڑی سے بڑی ایجاد کو انسٹرومنیٹلائیز کرنا روایت پسند ہونے کی راہ میں مانع نہیں۔اسی طرح چھوٹی سے چھوٹی مثلاً پانی کی ٹوٹی کو بھی آئیڈیلائیز کرنا آپ کے ماڈرنسٹ ہونے کی دلیل ہے۔یہ وضاحت ان کے لیے ہے جو جدید تہذیب کی تفہیم کی بحث میں سمجھے بغیر ''تو تم خود

موبائل، کمپیوٹر اور یہ اور وہ وغیرہ وغیرہ بھی تو استعمال کر رہے ہو" کی دلیل دے رہے ہوتے ہیں۔

کسی سائنسی ایجاد کو آئیڈیلائز کرنے کے نتائج اہلِ روایت کے لیے بتدریج تہذیبی رجوع پر ہی منتج ہو سکتے ہیں اس لیے کہ کوئی چیز مجرد وجود نہیں رکھتی بلکہ جس تہذیب میں موجود پائی جاتی ہے اس کے متعلق اس تہذیب کی نوعیت و ہیئت اس کی اقدار و ترجیحات، اس کے تصوراتِ خیر و شر اور پورے نظام زندگی کا اتا پتا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کسی صدیوں پرانی زیر استعمال رہنے والی چیز کو اس تہذیب کی معاشرت کی نوعیت کی تفہیم کا ماخذ سمجھتے ہیں۔

ہمارے ہاں عموماً اسلامسٹ جدید طرزِ زندگی سے استفادے کے لیے اور نت نئی سائنسی ایجادات کو دین کے ابلاغ کے لیے استعمال کرنے کے حق میں جب کوئی دلیل دیتے ہیں تو وہ چیزوں کو کُل (totality) میں دیکھنے اور اس کے ساتھ نتھی تہذیب کے اثرات کا جائزہ لیے بغیر اس کو مجرداً ایسے قبول کرنے کو لپکتے ہیں جیسے اس مغرب نے اس فطری اصول کے برعکس مجرد حالت میں آسمان سے گر کر اس اسلامسٹ کی جھولی میں اس سے اپنے دین کے ابلاغ کے لیے استعمال کی درخواست یا فرمائش کی ہو۔

حیرت ہے اس ریشنل (Rationale) ہونے کے زعم میں مبتلا اسلامسٹ کو اگر ہاتھ میں کوئی antiques پکڑائیں تو اس کا ذہن لازماً اس تہذیب اور معاشرت کے خدوخال اور اس طرزِ زندگی کے سہانے تصورات میں کھو جاتا ہے اور اس antiques کو اس کا ذہن مجرد دیکھنے کی بجائے ایک تہذیب سے نتھی کر کے ایک کُل میں دیکھتا ہے اور اسی کو وہ حقیقت پسندانہ رویہ سمجھتا ہے لیکن جیسے ہی جدید سائنسی ایجاد اس کے سامنے آئے تو وہ اسے مجرد دینی کام میں معاونت کے لیے استعمال کرتے ہوئے یہ بھول جاتا ہے کہ اس سے نتھی تہذیب و معاشرت کُل (totality) میں قبول یا رد کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

اسلام اور مغرب اسد مرزا

یورپی یونین کی حجاب پر مجوزہ پابندی

ایک غیر متوقع عدالتی فیصلے میں یورپی عدالت نے مسلم خواتین کے حجاب پہننے پر پابندی کی تجویز پیش کی ہے۔ اگرچہ ابھی تک کسی بھی رکن ملک نے اس عدالتی حکم پر ردِّعمل ظاہر نہیں کیا ہے لیکن توقع ہے کہ اس سے پورے یورپ میں ایک مرتبہ پھر اسلام مخالف جذبات میں شدت آسکتی ہے۔

مسلم خواتین کے حجاب پہننے کے موضوع نے یورپ کو برسوں سے تقسیم کر رکھا ہے اور یہ معاملہ بلجیم میں ایک بار پھر عدالتوں کے سامنے آیا، جب مشرقی شہر 'انس' کی ایک سرکاری ملازمہ کو بتایا گیا کہ وہ کام کے دوران حجاب نہیں پہن سکتی۔ یہ خاتون جو کہ ایک دفتر کے سربراہ کے طور پر اپنے فرائض انجام دیتی ہے اور عوام سے اس کا رابطہ بہت کم رہتا ہے اس نے اسی بنا پر بلجیم کی کورٹ میں ایک کیس کیا کہ اس کے آزادیٔ حق کی خلاف ورزی اس فیصلے سے ہو رہی ہے۔ بلجیم کی حکومت نے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے اس کیس پر رائے دہی کے لیے یہ کیس یوروپی یونین کی عدالت کو بھیج دیا۔

یورپی عدالت کا فیصلہ

یورپی یونین کی عدالت برائے انصاف (CJEU) نے اپنے فیصلے میں کہا کہ رکن ممالک کے حکام کے پاس عوامی خدمت کی غیر جانبداری کو یکساں بنانے کے لیے صوابدید کا ایک فرق بھی شامل کرنا چاہیے جس کا وہ فروغ کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم، اس مقصد کو ''مسلسل اور منظم طریقے سے'' حاصل کیا جانا چاہیے اور اقدامات کو ان افراد تک محدود ہونا چاہیے جن کے لیے وہ ضروری ہیں۔ ساتھ ہی اس نے مختلف ممالک کی قومی عدالت سے کہا کہ اس بات کی تصدیق کرنا کہ ان تقاضوں کی تعمیل کی گئی ہے، ان کی ذمہ داری ہے۔

CJEU نے پہلی بار 2017ء میں خواتین کے حجاب پہننے پر فیصلہ سنایا تھا جب لکسمبرگ

کی عدالت نے سوال کیا تھا کہ لباس پر پابندی کیسے لگائی جا سکتی ہے، لیکن صرف ایک عمومی پالیسی کے حصے کے طور پر جس میں تمام مذہبی اور سیاسی علامتوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہو۔ یعنی کہ اس وقت بھی عدالت نے یہی کہا تھا کہ اگر کسی سرکاری ملازم کی جانب سے کوئی ایسی چیز پہنی جاتی ہے جس سے اس کے مذہب کی نشاندہی ہوسکتی ہو تو یہ تمام مذاہب کے افراد پر اس کا اطلاق ہونا چاہیے۔ فیصلے میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ گاہک کارکنوں سے ہیڈ اسکارف اتارنے کا مطالبہ نہیں کر سکتے اگر وہ جس کمپنی میں کام کر رہے ہوں اس میں ایسی کوئی پالیسی موجود نہ ہو۔

CJEU کی طرف سے جاری کردہ ایک پریس بیان میں کہا گیا ہے کہ ۲۸/نومبر ۲۰۲۳ء کو عدالتِ انصاف نے، گرینڈ چیمبر میں بیٹھ کر، OP v Commune d'Ans (C-148/22) کے کیس میں اپنا فیصلہ سنایا، جس میں سے ابتدائی فیصلے کی درخواست کی بنا پر کام کی جگہ پر مذہبی نشانات پہننے کی ممانعت سے متعلق فیصلہ دیا گیا۔ اس میں واضح کیا گیا ہے کہ ہر شخص اپنے مذہبی نشانات یا کپڑے پہن سکتا ہے اگر اس پہناوے کے خلاف کوئی حکومتی یا کمپنی کی پالیسی موجود نہ ہو۔ ساتھ ہی عدالت کا کہنا تھا کہ اگر کوئی ایسا حکم یا آرڈر پہلے سے موجود ہے تو اس کا اطلاق تمام مذاہب پر یکساں طور پر ہونا چاہیے۔ اپنے فیصلے میں عدالت نے خاص طور پر اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ یہ قومی عدالتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کی تصدیق کریں کہ آیا ان تقاضوں پر عمل کیا جا رہا ہے یا نہیں۔

تاہم، اس حکم کے نتیجے میں یورپی یونین کے تمام سرکاری دفاتر غیر جانبداری کے مفاد میں ملازمین پر مذہبی علامتوں، جیسے کہ اسلامی ہیڈ اسکارف/حجاب پہننے پر پابندی لگا سکتے ہیں۔ ساتھ ہی عدالت نے کہا ہے کہ فلسفیانہ یا مذہبی عقائد سے جڑے لباس یا علامتوں پر پابندی کا اطلاق یکساں طور پر ہونا چاہیے۔ اس نے اپنے فیصلے میں کہا ''اس طرح کا قاعدہ امتیازی نہیں ہے اگر اس کا اطلاق تمام افراد پر یکساں طور پر کیا جائے۔'' شکایت کنندہ کے وکیل نے برطانوی اخبار دی گارڈین کو بتایا کہ ان علامتوں میں کراس کے ساتھ بالیاں یا ہار پہننا یا کرسمس پارٹیوں کا انعقاد کرنا بھی شامل ہیں۔

نئے فیصلے کے اثرات

یہ نیا عدالتی فیصلہ یقینی طور پر یورپ بھر میں ایک نیا تنازعہ شروع کرسکتا ہے جس سے مختلف وجوہات کی بنا پر اسلاموفوبیا کو مزید ہوا مل سکتی ہے۔

سب سے پہلے، اگرچہ عدالت نے اپنے فیصلے میں واضح طور پر تمام مذاہب کا احاطہ کیا ہے اور کسی بھی مذہبی نشان کو پہننے سے منع نہیں کیا ہے، پھر بھی ماضی کے تجربات کی بنیاد پر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عوام اور حکومتیں دونوں ہی اس شق کو نظر انداز کر دیں گی اور اپنی توانائیاں اور ردعمل صرف حجاب پر مرکوز کر دیں گی۔

دوم: یہ حکم ایک بار پھر حجاب یا پردے پر بحث کو ہوا دے سکتا ہے حالانکہ دونوں لباس بالکل مختلف ہیں۔لیکن یہ بیانیہ، جو ۲۰۰۶ء میں برطانیہ میں پردہ کے تنازعہ کے دوران قائم کیا گیا تھا، ایک بار پھر غیر متناسب اور غیر منطقی طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔حجاب کا مسئلہ گزشتہ برسوں میں پورے یورپ میں تفرقہ انگیز معاملہ رہا ہے اور ساتھ ہی حالیہ برسوں میں ہندوستان جیسے ملک میں بھی اس کے پہننے کی مخالفت شروع ہوگئی ہے۔

پورے یورپ میں دائیں بازو کے سیاست دانوں نے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا۔اس کی ایک وجہ یورپ میں بڑھتے ہوئے دائیں بازو کے نظریات بھی ہوسکتے ہیں، جیسا کہ ہالینڈ اور فرانس کے حالیہ انتخابات میں سامنے آیا ہے۔ یہ مختلف یورپی ممالک جیسے بلجیم، فرانس، جرمنی اور حال ہی میں نیدرلینڈز میں بڑھتی ہوئی دائیں بازو کی قوم پرستی کے پس منظر میں بھی سامنے آئے ہیں، جہاں دائیں بازو کی سیاسی جماعتیں اور زیادہ مقبولیت حاصل کرتی دکھائی دے رہی ہیں۔

ناقدین نے ان پابندیوں کو مذہبی آزادیوں پر حملہ قرار دیا ہے جو زیادہ تر خواتین کو متاثر کرتے ہیں۔غیر سرکاری تنظیم ہیومن رائٹس واچ نے کہا کہ جرمنی میں اساتذہ اور دیگر سرکاری ملازمین کے لیے مذہبی لباس اور علامتوں پر پابندی کی وجہ سے کچھ مسلمان خواتین نے تدریسی کیریئر ترک کر دیا ہے اور اب وہ بے روزگار ہیں یعنی کہ ان پابندیوں کا ایک منفی اثر۔

دریں اثناء فرانس میں چہرے کو ڈھانپنے پر پابندی کی وجہ سے گزشتہ تین سال سے بھی

کم عرصے میں تقریباً ۶۰۰ مسلم خواتین پر جرمانہ کیا گیا اور فرانس کے ۲۰۰۴ء کے اسکولوں میں حجاب پہننے پر پابندی کے قانون کے آنے کے بعد میں کچھ مسلمان لڑکیوں کو اسکول جانے سے بھی روک دیا ہے۔

برطانیہ میں سر پر اسکارف یا دیگر مذہبی علامتوں پر کوئی پابندی نہیں ہے۔فرانس میں، جو یورپی یونین کی سب سے بڑی مسلم کمیونٹیز میں سے ایک کی میزبانی کرتا ہے، ملک کے سیکولرازم کے بنیادی اصول پر عمل پیرا ہونے کے لیے بنائے گئے قوانین جسے''لائسائٹ'' کہا جاتا ہے،اس کے مطابق مسلم خواتین کے حجاب پہننے پر پابندی عائد کی گئی ہے۔

حال ہی میں فرانسیسی وزیر کھیل ایمیلی اوڈیا کاسٹیرا نے ستمبر میں کہا تھا کہ فرانسیسی ایتھلیٹس کو ملک کے سیکولرازم کے اصولوں کی پابندی کرنے کی ضرورت ہے یعنی کہ اس طرح ۲۰۲۴ء کے پیرس اولمپکس کے دوران خواتین ایتھلیٹس کے حجاب پہننے پر پابندی لگائی جاسکتی ہے۔

تاہم، اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کی ایک اہلکار نے 26 ستمبر کو صحافیوں سے بات کرتے ہوئے اس بات کی نشاندہی کی کہ حجاب پہننا عام حالات میں ایک بے ضرر عمل ہے، اور مذہبی وجوہات کی بنا پر سر پر اسکارف/حجاب پہننے پر پابندی لگانا کسی کے عقیدے کی آزادی کے حق کی خلاف ورزی ہے۔اقوام متحدہ کی اہلکار نے مزید وضاحت کی کہ''مخصوص حالات'' سے مراد ایسے حالات ہیں جو''عوامی تحفظ، امن عامہ، یا عوامی صحت یا اخلاقیات کے جائز خدشات کو ضروری اور متناسب انداز میں حل کرتے ہیں۔''

اس کے باوجود، بڑی تشویش یہ ہے کہ عدالت کا یہ تازہ فیصلہ خاص طور پر سوشل میڈیا پر بڑھتے ہوئے اسلاموفوبیا کو اور زیادہ فروغ دے سکتا ہے جیسا کہ فلسطین-اسرائیل جنگ کے شروع ہونے کے بعد سے دیکھا گیا ہے اور اس میں ہندوستان جیسے ملک بھی شامل ہیں جہاں کہ ملک میں اور بیرونِ ملک موجود دائیں بازو کے عناصر جلد ہی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جارحانہ مہم شروع کر سکتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے وہ اس وقت فلسطین کے خلاف محاذ آرا ہیں (بشکریہ المعارف، کراچی)۔